عیسوی ۱۹۹۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتے کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۲ ماہ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ماہ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ عدد ۱

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

معارف کی ڈاک

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو مختلف و متضاد چیزوں کا مجموعہ بنایا ہے، آسمان کے ساتھ زمین بنائی۔ سورج کیساتھ چاند بنایا، دن اور رات دونوں پیدا کیے اور نور کیطرح ظلمت اور دھوپ کیطرح چھاؤں کو پیدا کیا، یہ سب بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان کی شکل و ہیئت، ماہیت و خصوصیت میں بڑا فرق ہے، انکے ظہور کے طریقے اور کائنات پر مترتب ہونے والے اثرات بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں، لیکن اسکے باوجود ان میں کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ بڑی موافقت اور سازگاری ہے انکی ہم آہنگی اور ربط و اتصال ہی کی وجہ سے وہ مفید اور صالح نتائج برآمد ہوتے ہیں جن پر کائنات کے بقا کا انحصار ہے، اگر ان اجزائے مختلفہ کے توازن کو مدبر کائنات قائم نہ رکھتا اور انکو اس قدر موزوں اور مناسب طریقے سے نہ بناتا تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔

یہ متضاد عناصر ایک مقررہ نظام کے تحت اپنے اپنے دائروں میں شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سورج چاند کے دائرے میں اور چاند سورج کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا، دن اپنے مقررہ وقت پر آتا ہے اور رات بھی خاص وقت پر نمودار ہوتی ہے، ان میں سے کسی کی بھی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے حدود سے تجاوز کرے، خالق کائنات نے ہر ایک کے دائرے متعین کر کے اسکو اسکا پابند بنا دیا ہے، اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے مقررہ اصول و ضوابط سے انحراف کرے اور طغیان و سرکشی پر آمادہ ہو تو دنیا کی تباہی لازمی ہے، ان مختلف اجزا کا باہم تعاون سے کائنات کے مقاصد و مصالح کی تکمیل میں لگے رہنا، انسان کو بھی خدا کے بتائے ہوئے حدود کی پابندی کی دعوت دیتا ہے، اگر اس نے طغیان و سرکشی کا رویہ اختیار کیا تو زمین شر و فساد سے معمور ہو جائے گی حالانکہ دنیا کا بنانے والا شر و فساد کو پسند نہیں کرتا۔

ان متضاد اشیا کی خلقت اور انسانوں کے لیے انکی تسخیر و فیض بخشی خالق کائنات کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا پتہ دیتی ہے، ان کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو بے لگام اور آزاد نہ چھوڑے

بلکہ انکے افعال و اعمال اور حرکات و سکنات پر نظر رکھے اور اسی کے مطابق انہیں سزا و جزا دے ورنہ اسکی رحمت و ربوبیت اور قدرت و حکمت بے معنیٰ ہو جائے گی اور یہ کارخانۂ عالم عبث اور بیکار قرار پائے گا، خدا نے مخلوقات کو جوڑے جوڑے (نر و مادہ) پیدا کیا ہے ان میں سے ہر ایک کا علاحدہ وجود اپنے اندر جو خلا رکھتا ہے وہ نہ اسکے جوڑے کے بغیر پُر ہو سکتا ہے اور نہ اپنی غایت کو پہنچ سکتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی کامل الوجود ہستی ایسی ہے جو ہر نقص سے پاک ہے اور جس کی قدرت و حکمت ان متضاد عناصر میں ربط و ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں بامقصد بناتی ہے وہی دنیا کے خلا کو پُر کرنے کیلئے آخرت کو بھی ظہور میں لائے گی ورنہ دنیا کھیل تماشہ بن کر رہ جائے گی۔

عالمِ کائنات کی طرح نفسِ انسانی کا عالم بھی خیر و شر کے متضاد عوامل و محرکات کا مرکب ہے خالقِ کائنات نے انسانی فطرت میں خیر و شر نیکی و بدی اور بھلائی اور برائی کی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں لیکن نیکی و بدی کا شعور اور خیر و شر میں امتیاز کا ذوق بھی بخشا ہے جس کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو آلایش اور گندگی سے پاک رکھے خیر پر شر کو حاوی نہ ہونے دے نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے بچے، اپنے کو آزاد اور بے لگام سمجھ کر طغیان و فساد میں مبتلا نہ ہو کیونکہ خالقِ کائنات فساد برپا کرنیوالوں کو بس ایک حد تک اپنی مصلحت کے مطابق چھوٹ دیتا ہے جب یہ اس حد سے آگے بڑھتے ہیں تو وہ اپنی زمین کو فساد برپا کرنے والوں سے پاک کر دیتا ہے کیونکہ انکا وجود دنیا کے لیے خطرناک بن جاتا ہے۔

دنیا میں انسان کو یُسر و عُسر اور فراخی و تنگی دونوں حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے، اسکا مقصد اسکی ابتلا و آزمایش ہے مگر جب اللہ لوگوں پر اپنا فضل و کرم فرماتا ہے اور انہیں رزق کی فراوانی اور آسایش و کشادگی عطا کرتا ہے تو وہ اکڑنے اور اترانے لگتے ہیں اور طغیان و سرکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے استحقاق کی بنا پر اللہ نے ان کا اعزاز و اکرام کیا ہے اور جو لوگ تنگی اور عسرت سے دوچار رہتے ہیں وہ مایوس اور دل شکستہ ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے ان کی تذلیل کی ہے لیکن خدا کے شاکر و صابر بندے نہ نعمت پاکر مغرور ہوتے ہیں اور نہ فقر کی

آزمائش میں دلگیر ہوتے ہیں، کیونکہ کائنات کا مالک جس طرح نعمتیں دے سکتا ہے اسی طرح ان کو چھین بھی سکتا ہے، کسی فرد کی مشکلات و آزمائشیں دائمی نہیں ہوتیں، رات کے بعد دن اور تاریکی کے بعد روشنی آتی ہے، اس لیے رنج و زحمت بھی اسی وقت تک کے لیے ہیں جب تک یہ خدا کی مصلحت اور آدمی کی تربیت کے لیے ضروری ہوتے ہیں، صبر و شکر ہی سے انسان کو وہ نفس مطمئنہ حاصل ہوتا ہے جو اسے راضی برضا رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ دارالمصنفین کے قدیم اور مخلص خدمت گذار مولوی عبدالباری صاحب ۳۰ جون کو وفات پا گئے، ان کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی، دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انہیں تصحیح اور کتب خانہ کی نگرانی کے کام پر مامور کیا تھا جسکو دو برس پہلے تک وہ انجام دیتے رہے، دارالمصنفین کے عروج کا دور دیکھنے والے اب تنہا وہی رہ گئے تھے، ان کی تعلیم مدرستہ الاصلاح سرائمیر میں ہوئی تھی اور وہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے ہم سبق تھے، دارالمصنفین سے وابستگی کی وجہ سے انہیں مضمون نگاری کا چسکہ لگ گیا تھا، ابو علی اثری اور ابو علی اعظمی کے نام سے مدۃ العمر اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے رہے، علامہ شبلیؒ کے بڑے مداح اور سید صاحب کے نہایت عقیدتمند تھے، ان کا ذکر برابر لطف و لذت سے کرتے تھے ان پر اور مولانا ابوالکلام آزاد پر بے شمار مضامین لکھے، دونوں بزرگوں پر انکے مضامین کے ایک ایک مجموعے ضیاء اللہ کھوکھر صاحب (گوجرانوالہ۔ پاکستان) نے شایع کیا تھا، اپنی خودداری کی وجہ سے کسی کا منت کش ہونا گوارا نہیں کیا اور قناعت پسندی کی بنا پر ایک قلیل مشاہرہ پر پوری زندگی گذار دی، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف فرمائے اور جنت نعیم میں جگہ دے آمین۔

مقالات

مسلکِ سلیمانی

از جناب مولانا غلام محمد صاحب کراچی

ایک ایسے دور میں جو اہل کمال علماء و فضلاء کا دور تھا، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ایک انفرادیت حاصل تھی۔ انکی ذات میں شاہ ولی اللہ کا عمق اور عبقریت، علامہ ابن قیمؒ کی وسعت اور محتاط فکری حریت اور امام غزالیؒ کی حکمت و قلبیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، اس لیے ان کو سمجھنے اور ان کے مسلک کا واضح تصور حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کوشش میں ضروری ہے کہ نہ تو اپنے ذوق اور رنگ کو آنے دیا جائے اور نہ تنقید یا توثیقِ غیر کے خیال کو کوئی اہمیت دی جائے بلکہ ان کو ویسا ہی دیکھا جائے جس انداز سے وہ بزم آرا رہے۔

حضرت علامہ کی شخصیت چونکہ پہلو دار ہے اس لیے ہم اختصار کے ساتھ مگر الگ الگ دیکھیں گے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور اجتماعیت میں انکا مسلک کیا تھا؟

تفسیری مسلک حضرت علامہ کے نزدیک قرآن پاک کا سب سے یقینی اور صحیح مطلب و مفہوم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے متعین ہوتا ہے، اسی لیے قرآن فہمی کے لیے بنیادی توجہ حدیث و سنت پر رہنی ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"قرآن خدا کا کلام ہے جو ۲۳ برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے ملک عرب میں فصیح و بلیغ عربی زبان میں خدا کے ایک برگزیدہ بندہ پر اترا۔ اس میں نظریے بھی تھے اور عملی تعلیم بھی۔ اس نے ان نظریوں کو خدا کے بندوں کو سمجھایا اور ان کی عملی تعلیمات کو عملاً کر کے اور برت کے اپنے آس پاس والوں کو دکھایا اور بتایا اور اس لیے کہ وہ اس کلام کا پہلا مخاطب تھا اور اسی کے ذریعہ اس کلام کا مطلب دوسروں کو سمجھانا تھا۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہی اسلام کے مطلب کو سب سے معتبر سمجھ سکتا تھا اور اسی لیے اس کلام کا جو مطلب سمجھا اور اپنی تعلیم اور عمل سے اس نے دوسروں کو جو سمجھایا وہی اس کا صحیح اور بے خطا مطلب اور مفہوم ہے۔ اس لیے قرآن پاک کے سمجھنے کے لیے حامل قرآن محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور عملی تفسیر سے بہتر قرآن کی تفسیر کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔"[1]

اس کے بعد دوسری چیز زبانِ عربی، اس کے قواعد اور محاورۂ عرب سے پوری پوری آگاہی ہے، جس کے بغیر قرآن پاک کی صحیح تفسیر ممکن نہیں۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں :۔

"کسی کتاب کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے سب سے اہم چیز اس کتاب کی زبان اور اس زبان کے قواعد کی پیروی ہے۔ یہ کسی طرح درست نہ ہوگا کہ ہم عقلیت کے جوش میں اس کتاب کے کسی فقرہ کی تشریح میں اس زبان کی لغت اور قواعد میں ایسا تصرف کریں جو ہر حیثیت سے ناجائز ہو اور ہمارے اس تصرف کا منشا صرف اتنا ہو کہ ہم اپنے استعداد عقلی کی تسکین کر سکیں۔"[2]

---

[1] معارف، جلد ۴۱ شمارہ ۲۔ اعظم گڈھ، فروری ۱۹۳۸ء مقالہ "مقدمہ تفسیر جواہر" ص ۸۵-۸۶۔
[2] معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۳۸ء ص ۸۷۔

اس کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ بہت غور سے سننے کی ہے تحریر فرماتے ہیں:-

"حالانکہ استبعادِ عقلی کوئی یکساں چیز نہیں اور نہ وہ خلافِ عقل کے معنوں میں ہے عقل کی وسعت اور استبعاداتِ عقلی کی فہرست ہر زمانہ میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے اس لیے قرآن پاک کی تفسیر کا یہ معیار نہیں بنایا جا سکتا"[1]

اب رہی یہ بات کہ ہر زمانہ میں عقلی مسلمات بدلتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے فکری فضا بھی بدلتی رہتی ہے اور ہر دور کے لوگ اپنے زمانہ کے موثرات کے تحت ہی کسی بھی کلام کو سمجھنا چاہتے ہیں اس لیے قرآن فہمی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ٹھہر سکتی تو اس کا جواب حضرت علامہ یہ دیتے ہیں:-

"فانی انسانوں کے فانی کلام اور جزئی علم رکھنے والوں کے جزئی علم اگر ایک زمانہ میں صحیح اور دوسرے زمانہ میں غلط ہو جائیں تو ایسا ہونا بہت حد تک قرین قیاس ہے، مگر خدائے پاک کے کلام میں، جس کا علم ازل سے ابد تک کو محیط ہے، اس قسم کا تصور بھی ذہن میں نہیں لایا جا سکتا، اس لیے اگر مخلص اہلِ علم اور نیک نیت علماء اس کلام کی مزید تشریح اپنے زمانہ کے موثرات کے مطابق اس طرح کریں کہ وہ متکلم کے اصول متواترہ، مخاطب اول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم اور زبان کی لغت و قواعد کے خلاف نہ ہوں تو ان کی یہ سعی مشکور ہو گی۔ اسی بنا پر جب مسلمانوں میں عقلیات کا رواج ہوا، اس نظر سے بھی قرآن پاک کی تفسیریں لکھی گئیں۔ معتزلہ میں ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر اور قاضی عبدالجبار کی تنزیہ القرآن اور اہل سنت میں امام ابو منصور ماتریدی کی تاویلات اور امام ابن فورک کی

[1] معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۳۶ء ص ۸۰۔

مشکلات القرآن، امام محمد غزالی کی جواہر القرآن اور سب سے آخر میں امام فخر رازی کی
تفسیر کبیر اپنے اپنے زمانہ کے موثرات کی بہترین ترجمان ہیں۔[1]

"اپنے اپنے زمانہ کے موثرات کی بہترین ترجمان" کا جملہ خوب ذہن نشین رہے
کیونکہ اسی بنیاد پر علامہ مرحوم آخر حیات تک یہی فرماتے تھے کہ قرآن کی "بہترین" تفسیر
کسی بھی تفسیر کو قرار نہیں دیا جا سکتا، یہی جواب انھوں نے عین مرض وفات میں اس
وقت کے سفیر شام متعینہ پاکستان کو بھی دیا تھا، جب سفیر صاحب نے ان سے پوچھا
تھا کہ قرآن پاک کی سب سے اچھی تفسیر کون سی ہے ؟

حضرت علامہ کے تفسیری مسلک کے سلسلے میں ایک اور اہم بات یاد رکھنے کی
یہ ہے کہ وہ الفاظ قرآنی کے مراد ظاہری سے عدول کو روا نہیں رکھتے تھے۔ میرے
استاد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو قرآنی آیات سے اعتبارات، صوفیانہ نکات
اور آیات کے نتائج قیاسی نکالنے کا خاص ذوق تھا اور اس کے اثر سے اس عاجز
کی طبیعت بھی اس نہج کے نکتوں اور چٹکلوں کو پڑھ کر جھوم جاتی ہے، مگر جب جب
ایسی کوئی بات میں نے حضرت علامہ سے نقل کی تو سختی سے متنبہ فرمایا کہ الفاظ قرآنی
کے "ظاہر مراد" سے عدول نہ ہونا چاہیے، نیز خود قرآنی مراد کو معلوم کرنے کے لیے
ایک ہی لفظ کے جتنے استعمالات قرآن پاک میں آئے ہیں ان سب کا احاطہ کر کے
اس کی مراد کو متعین کرنا چاہیے، مثلاً قرآن پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
"خاتم النبیین" کہتا ہے تو اب دیکھنا چاہیے کہ لفظ "خاتم" قرآن پاک میں کس کس
معنی میں بولا گیا ہے تاکہ ختم نبوت کا قرآنی مفہوم متعین ہو سکے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو

---

[1] معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۳۶ء ص ۸۷ - ۸۸ -

یہ لفظ یا تو اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ باہر کی چیز اندر نہ جا سکے، جیسے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ[1] (یعنی رسول کی بات دل میں نہیں جا سکتی)، یا پھر اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ اندر کی چیز باہر نہ نکل سکے، جیسے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ[2] (یعنی حشر کے دن کافروں کے دل کی کوئی بات منھ سے باہر نہ نکل سکے گی)، یا پھر یہ لفظ ان دونوں معنوں کی یکجائی کے ساتھ بولا گیا ہے جیسے وَخِتَامُهٗ مِسْكٌ[3] (جنتیوں کو جو شراب ملے گی اس پر مشک کا ختام ہوگا جو اس بات کی ضمانت ہوگی کہ اس بوتل کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ اب اس میں سے نہ تو اندر کی چیز باہر آ سکتی ہے نہ باہر سے کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو سکتی ہے) بس ان تین استعمالات کے سوا لفظ "خاتم" کا کوئی اور استعمال قرآن پاک میں نہیں ملتا، اس لیے "خاتم النبیین" کا قرآنی مفہوم صاف یہ نکل آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی میں نبیوں کے خاتم بنائے گئے ہیں کہ آپ سے پہلے جو زمرۂ نبوت میں داخل ہو چکے ان میں سے کوئی بھی اب زمرۂ نبوت سے خارج تصور نہیں کیا جا سکتا اور آپ کے بعد باہر سے کوئی اس زمرۂ مقدسہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ یہ ہے فہم قرآن اور فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ کا تازہ اعجاز، اور یہ تو ایک مثال ہے، "سیرت النبیؐ" کی ضخیم مجلدات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو علامہ فہامہ کا یہ مسلک و ذوق تفسیری جگہ جگہ نمایاں نظر آئے گا۔ ع

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اب ایک آخری بات تفسیری مسلک کے سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۷۔ [2] سورۂ یٰسین، آیت ۶۵ [3] سورۂ مطففین، آیت ۲۶۔

"متشابہات قرآنی" کے بارے میں حضرت علامہ کا مسلک قدمائے اہل سنت والجماعۃ والا مسلک تھا کہ خدا کی ذات و صفات اور دیگر عقائد کے متعلق قرآن پاک نے جو کچھ بیان کیا ہے یا پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ تواتر جو کچھ ثابت ہے اس پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی عقل و قیاس اور استنباط سے اس کی تشریح کرنا صحیح نہیں ہے، گویا حضرت علامہ کے نزدیک وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ[1] (اس کا منشاء و مفہوم خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا) ایک حقیقتِ اعتقادیہ ہے، جس سے یہ مسلک بنا کہ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا[2] یعنی جو پختہ علم ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ بس ہم اس پر ایمان لائے کہ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں بالفاظ دیگر متشابہات کے معاملے میں حضرت علامہ تشبیہ کے قائل تھے مگر تنزیہ کے ساتھ۔ وہ یَد۔ قَدَم۔ اِسْتَوٰی وغیرہ کی تاویل نہیں فرماتے تھے مگر ان میں کی ہر حقیقت کو لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ[3] کے وصف سے متصف جان کر ہر تشبیہ کو تصور انسانی سے پاک اور رسائی فہم سے وری الوریٰ سمجھتے تھے۔

حدیثی مسلک | قرآن پاک کے بعد دین کی دوسری اہم اصل حدیث نبوی ہے۔ قرآن و حدیث کے باہمی ربط اور نزاکتِ ارتباط کو حضرت علامہ نے ایک وجد آفریں جملہ میں یوں ادا فرمایا ہے:۔

> "علم قرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی، یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۷، [2] ایضاً [3] سورۂ شوریٰ آیت ۹۔

ہرآن ان کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے۔[1]

حدیث پڑھنے پڑھانے والے علماء بحمداللہ ہر دور میں بہت رہے ہیں اور رہیں گے مگر جو خود محدثانہ مزاج اور رنگ نسبت کا مرقع ہوں ایسے محدث خال خال ہی ملیں گے۔ حضرت علامہ اسی منتخب فہرست کے فرد فرید تھے، ان کی تاریخ دانی کا شہرہ خود ہی ان کے مفسرانہ اور محدثانہ کمالات کا حجاب بنا ہوا تھا، اس پر ادارتی تعصب نے ان کے معاصرین کے ہاتھوں اس کو ایک دیوار بنا کر کھڑا کر دیا ورنہ سیرۃ النبیؐ خصوصاً اس کی جلد سوم، سیرت عائشہؓ، خطبات مدراس کا ایک غیر جانب دار پڑھنے والا اور فن حدیث کا واقف کار علامہ کے جلیل القدر محدث اور ماہرِ فن رجال ہونے کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ حضرت علامہ محدث تھے اور ان کا حدیثی مسلک احتیاط اور حزم محدثانہ پر مبنی تھا۔ وہ اس وقت بھی اس معاملہ میں سخت تھے جب باضابطہ حلقۂ طریقت میں داخل نہیں ہوئے تھے اور اس وقت بھی ویسے ہی مستحکم رہے جب وہ شیخ طریقت مانے گئے۔ اکثر صوفیائے کرام اپنے ذوق یا وجدان کے سہارے بعض مقولوں کو حدیث کے عنوان سے بیان کرتے ہیں، ادھر حضرات علماء اپنے موضوعہ اصولوں پر "فضائل" میں توسیع اختیار کر کے ضعیف ترین احادیث کو اپنی تصانیف میں فراخی کے ساتھ شامل رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے مگر حضرت علامہ کا مسلک کسی پہلو سے بھی ان گنجائشوں کا متحمل نہیں تھا۔ وہ فرماتے تھے (اور اس وقت ان پر خوف چھا جاتا تھا) کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سُن کر کہ من کذب علیّ متعمداً

---

[1] "تعارف" تدوین حدیث مصنفہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مکتبہ اسحاقیہ کراچی ۱۹۶۵ء ص "د"

فلیتبوأ مقعدہ من النار (بخاری) (یعنی جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرلے) میرا دل لرز جاتا ہے کہ مبادا کوئی قول ایسا حضورؐ کی طرف منسوب ہو جائے جو آپؐ نے نہ فرمایا ہو اور اس کی وجہ سے اس وعید کا مورد بننا پڑے۔ راقم الحروف نے حضرت علامہ کا منشاء یہ سمجھا کہ حزم واحتیاط کے سبب کوئی ارشاد نبویؐ نقل سے رہ جائے تو اس پر تو کسی عتاب وعقاب کا اندیشہ نہیں مگر غلط انتساب سے تو جہنم مول لینا ہوگا، العیاذ باللہ اسی لیے دیکھا اور بار بار دیکھا کہ قبول حدیث میں علامہ نے کبھی عرفی دباؤ بھی قبول نہیں فرمایا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مولوی صاحب نے حضرت علامہ سے سوال کیا کہ کیا اقطاب وابدال کا موجود ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟ علامہ نے فرمایا کہ نہیں البتہ بہ کثرت بزرگوں کی کشفی تصدیقات ملتی ہیں اور وہ کافی ہیں اس پر انھوں نے تعجب سے مکرر عرض کیا کہ احادیث میں بھی اس کا ذکر نہیں؟ حضرت علامہ نے اپنی طبعی نرم مزاجی سے دوبارہ فرمایا "جی نہیں، کوئی صحیح اور قوی حدیث ایسی نہیں ملتی"۔ اس پر ان مولوی صاحب نے دباؤ ڈالنے کے لیے یہ کہہ دیا کہ حضرت مولانا تھانویؒ (جو حضرت علامہ کے پیر طریقت تھے) نے تو تعلیم الدین میں تائیدی حدیثیں تحریر فرمائی ہیں، حضرت علامہ کو ان کا یہ غیر عالمانہ طرز ناگوار ہوا اور قدرے چیں بہ جبیں ہوکر فرمایا:۔

"حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے، میں نے تو نہیں لکھا، آپ مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں"۔

پھر جب یہ صاحب چلے گئے تو احقر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ میں کیا کروں، میرا

تو دل لرز جاتا ہے کہ کوئی قول حضورؐ کی جانب ایسا منسوب ہو جو آپؐ کا ارشاد نہ ہو۔

اقطاب و ابدال والی بات تو خیر ایسی ایسی اہمیت کی نہیں مگر "ظہور مہدی" کے بارے میں تو ہمارے عام محدثین حتیٰ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تک کئی حدیثیں اپنے رسالہ آثار قیامت وغیرہ میں تحریر فرمائی ہیں مگر حضرت علامہ نے اپنے مسلکِ احتیاط کی بنا پر یہاں بھی بہ تمام ادب ان اکابر سے الگ ہو رہنا ہی گوارا فرمایا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے "ظہور مہدی" سے متعلقہ حدیثی روایات کے بارے میں دریافت کیا تو علامہ نے صاف فرما دیا کہ ان روایات میں ایک روایت بھی مجھے ایسی نہیں ملی جس میں کوئی نہ کوئی راوی شیعی نہ آگیا ہو، اس لیے یہ روایات ساقط الاعتبار ہیں۔

جہاں تک درس و تعلیم حدیث کا تعلق ہے، میں نے یہ بات بصراحت حضرت علامہ سے پوچھی تھی کہ کتب احادیث تو سب وہی ہیں پھر فلاں اور فلاں مدرسہ کی تعلیم حدیث میں فرق کیا ہے؟ فرمایا کہ فلاں مدرسہ میں تو حدیث کو حدیث کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے اور فلاں مدرسہ میں حدیث کو حنفی کر کے پڑھایا جاتا ہے، اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ حضرت علامہ یہ چاہتے تھے کہ حدیث پڑھاتے وقت کسی بھی فقہی مذہب کے تحفظ ذہنی کے بغیر اقوال نبویؐ کے منشاء کو پانے کی کوشش کرنی چاہیے، درس حدیث میں اس بات کی طرف التفات نہ رہنا چاہیے کہ کس حدیث سے کس فقہی مذہب کی تائید ہو رہی ہے اور کونسی روایت کس کے خلاف جا رہی ہے۔ یہ کام تو فقہ کے درس میں کرنے کا ہے۔

رہی بات ادب و تعظیم حدیث کی، اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے

نکلیے۔ ایک مرتبہ حضرت علامہ کی مجلس میں ایک صاحب نے بالکل موضوع حدیث نقل کردی۔ میں بے صبری سے کہہ پڑا کہ "یہ حدیث غلط ہے" حالانکہ وہ حضرت علامہ سے مخاطب تھے اور پھر حضرت علامہ ہی نے انہیں سلیقے سے غلطی پر متنبہ فرمایا۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو علامہ نے اس ادب ناشناس کو مخاطب کرکے نہایت نرمی سے فرمایا کہ "روایت غلط سہی انتسابی نسبت کا احترام تو ضروری ہے، ایسے موقع پر توقف کرکے یوں کہنا چاہیے کہ یہ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے یا حضورؐ کا ارشاد ایسا نہیں ہے" اللہ اکبر، کیا پاسِ ادب ہے !!

فقہی مسلک | حضرت علامہ کے فقہی مسلک کے بارے میں اہل علم مختلف نظر آتے ہیں، بعضے ان کو غیر مقلد سمجھتے ہیں اور بعضے مقلد۔ جو غیر مقلد سمجھتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ علامہ کی تحریروں میں جامد تقلیدی رنگ نظر نہیں آتا اور جو ان کو مقلد خیال کرتے ہیں وہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے علامہ کو ہمیشہ حنفی طرز پر نماز پڑھتے دیکھا یا تقلید کے خلاف ان کے قلم یا زبان سے کوئی بات نہیں سنی، مجھ بے استحقاق کو بحمداللہ حضرت علامہ کے قرب و صحبت کی سعادت حاصل رہی ہے اور ان کی تصانیف کو بغور دیکھا ہے اس لیے صحیح صورت حال سے یقینی آگاہی ہے اور وہ یہ ہے کہ علامہ مقلد ہی تھے مگر ان کا تقلیدی رنگ وہ تھا جو دور تابعین کے بعد سے اسلام کی چوتھی صدی کے ختم تک رہا کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ عوام تک کسی خاص شخص کی فقہ کے پابند نہ تھے اور خواص کا طرز تقلید یہ تھا کہ :

"ان کو کسی مسئلہ میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں رہتی تھی اور ان کے پاس بہت سی احادیث مستفیضہ یا صحیح تھیں جن پر بعض فقہا عمل کر چکے تھے .... اگر تعارض

نقل اور وجہ ترجیح ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے کسی مسئلہ میں ان کا دل مطمئن نہ ہوتا تھا تو گزشتہ فقہا میں سے کسی کے کلام کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے اور اگر اس مسئلہ میں فقہا کے دو قول ان کو ملتے تو ان میں سے جو زیادہ قابل اعتماد ہوتا اسکو وہ اختیار کرتے تھے خواہ وہ قول اہل مدینہ کا ہو یا اہل کوفہ کا۔“[1]

چنانچہ حضرت علامہ نے تراجم علمائے اہل حدیث مولفہ ابو یحییٰ امام خاں نوشہری پر جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے، اس میں اپنی بابت رقم طراز ہیں:۔

• میں سنت کا پیرو اور توحید خالص کا معتقد ہوں، سنت کو دلیل راہ مانتا ہوں اور علما کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا جانتا ہوں اور حق کو ائمہ سلف میں کسی ایک میں منحصر نہیں سمجھتا۔ اس پر آپ مجھے جو چاہیں سمجھ لیں۔“[2]

یہ تحریر ۱۳ صفر ۱۳۵۸ھ کی ہے اور علامہ کا سن وفات ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ تھا، گویا وفات سے تقریباً پندرہ برس قبل کا یہ اظہار ہے، مگر اس سے واضح تر تحریر جو مسلک فقہی کی صراحت ہی کے لیے علامہ نے لکھی تھی وہ ۱۲ شعبان ۱۳۴۵ھ کے اس مکتوب میں ملتی ہے جو انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام تحریر فرمایا تھا، وہ یہ ہے:۔

” فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں مگر اہل حدیث بالمعنی المتعارف نہیں ہوں۔ ائمہ رحمہم اللہ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیتہً ان سے عدول حق نہیں سمجھتا۔“[3]

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول۔ مترجمہ عبدالحق حقانی، کراچی سال اشاعت ندارد ص ۲۵۴

[2] ابو یحییٰ امام خاں نوشہری۔ تراجم علمائے اہل حدیث ص [3] تذکرۂ سلیمان مصنفہ راقم الحروف کراچی ۱۹۸۶ء طبع ثانی ص ۹۹

اس توضیح کے بعد علامہ کے فقہی مسلک میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ رہی یہ بات کہ یہ مسلک اہل نظر کی نگاہ میں علامہ جیسے صاحب خبرو نظر کے لیے کیسا ہے تو اس کے لیے حضرت مولانا تھانویؒ کی تصدیق ملاحظہ ہو۔ حضرت ممدوح کی جوابی تحریر ہے:۔

"جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا، دو وجہ سے، ایک صدق و خلوص پر دال ہونے سے، دوسرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے، تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے کسی جزئی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی صرف رنگ بدلتا ہے چنانچہ اس احقر پر ...... دوسرا رنگ ہے کہ میں بوجہ اپنی قلتِ روایت و درایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں"[1]

غرض گو اکثر امور میں حضرت علامہ حنفی مذہب ہی کے پیرو تھے، رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ تراویح میں بیس رکعت کا التزام تھا مگر ساتھ ہی قرأت فاتحہ خلف الامام اور ناگزیر صورت میں جمع بین الصلاتین پر بھی ان کا عمل تھا۔ اسی طرح فتوی لکھنے میں شدومد سے ایک مسلک کے پابند نہ تھے۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے بھی اپنے مضمون "استاذ مرحوم نقوش و تاثرات" میں حضرت علامہ کا یہ مختصر مگر بے غبار جملہ نقل فرمایا ہے کہ:۔

"میں نے بعیت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے"[2]

اس سلسلہ کا ایک چشم دید واقعہ سنیے اور اس سے حکمت سلیمانی کا اندازہ

---

[1] تذکرۂ سلیمان، مصنفہ راقم الحروف، کراچی ۱۹۸۲ء طبع ثانی ص ۱۰۲ [2] مولانا مسعود عالم ندوی "استاذ مرحوم نقوش و تاثرات" مقالہ مشمولہ "معارف" سلیمان نمبر، اعظم گڈھ مئی ۱۹۵۵ء ص ۱۴۷۔

لگایئے۔ ایک انگریز میاں بیوی مشرف بہ اسلام ہوئے، چند ہی روز بعد آپس کی ناچاقی میں شوہر نے بیوی سے ایسے کلمات کہہ ڈالے کہ مذہب حنفی کی رو سے طلاق مغلظ واقع ہوگئی۔ یہ ماجرا ان کے ایک مسلمان دوست عزیز نے سنا تو انھوں نے شوہر سے کہا کہ تمہارا تو نکاح ہی فسخ ہوگیا، اب تو نومسلم میاں بیوی بھی پریشان اور ان کے دوست بھی حیران۔ احتیاطاً ان دوست نے بعض معتبر مفتیوں سے رجوع کیا مگر جواب ہر جگہ سے طلاق قطعی ہی کا ملا، پھر وہ حضرت علامہ کی خدمت میں آئے، سارا ماجرا سنایا۔ علامہ نے فرمایا کہ بھئی مفتی صاحب (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ) سے پوچھیے، انھوں نے عرض کیا کہ وہاں سے تو یہی جواب ملا۔ علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا تو آپ کا جی کیا چاہتا ہے کہ جواب برعکس ملے؟ اس پر وہ چپ ہو رہے، تب علامہ نے ان سے فرمایا کہ آپ ایک استفتا لکھ کر کل مفتی صاحب کے مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں لایئے، مجھے جو کچھ لکھنا ہے میں وہیں لکھ دوں گا، چنانچہ دوسرے روز جلسہ جب ختم ہوا اور مخصوص علماء جن میں حضرت مفتی محمد حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور خود حضرت میزبان ممتاز ترین تھے۔ چائے نوشی کے لیے ایک کمرے میں بیٹھ گئے تو علامہ نے ان صاحب سے استفتاء لے کر ایک ایک کو دکھلایا، متفقہ جواب یہ تھا کہ "طلاق واقع ہوگئی" پھر حضرت علامہ نے اپنے قلم سے اس پر فتویٰ یہ تحریر فرمایا کہ "اہل سنت والجماعت میں مسلک اہل حدیث کی رو سے طلاق واقع نہیں ہوئی رجوع کرا دیا جائے" (لفظی تغیر ممکن ہے، غالب یادداشت یہی ہے) پھر علمائے کرام کو یہ جواب دکھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ نومسلم بیچارے تو ابھی نہ حنفی ہیں اور نہ شافعی لہذا قانون میں کوئی گنجایش بھی نکلتی ہو تو اس کا فائدہ

انہیں ملنا چاہیے۔اس پر مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برملا فرمایا کہ یہ جواب حضرت ہی لکھ سکتے تھے ہم چونکہ فقہ حنفی کے مفتی ہیں اس لیے نہیں لکھ سکتے تھے، پھر مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ نے بھی اس قول کی تائید فرمائی۔

ایک اختلافی مسئلہ "طلاق مکرہ" کا بھی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک کوئی شخص اپنی بیوی کو خوف و ڈر کی وجہ سے بادل ناخواستہ جبراً طلاق دیدے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، امام مالکؒ اور اکثر اصحابِ حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی، حضرت علامہ "طلاق مکرہ" کے واقع نہ ہونے ہی کے قائل تھے، اپنی تصنیف حیات امام مالکؒ میں امام دار الہجرۃ کے مسلک کو جہاں بیان فرمایا ہے وہاں اپنے متعلق یہ طویل حاشیہ لکھا ہے :۔

"اس مسئلہ کے متعلق مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک مناظرہ یاد آگیا ہمارے استادِ فقہ مولانا مفتی عبداللطیف صاحب مدرس اول دار العلوم و تلمیذ رشید مولانا لطف اللہ صاحب اطال اللہ بقاہما ہیں۔ جناب مفتی صاحب کو فقہ حنفی کی صحت کلی میں نہایت شدت کے ساتھ غلو ہے اور جس سے میں بدطفولیت سے محروم ہوں۔ طلاق مکرہ کے مسئلہ میں ہماری جماعت میں اختلاف ہوا۔ میرے سوا تمام طلبہ وقوع کے قائل تھے، میں حضرت عائشہؓ کی حدیث لا طلاق ولا عتاق فی الاغلاق (حالت جبر و اکراہ میں طلاق و عتاق نہیں)، پیش کرتا تھا اور ان کی طرف سے ثلث جدھن و ھزلھن سواء (تین چیزوں میں اظہار واقعیت اور مذاق دونوں برابر ہیں) طلاق کی حدیث پیش کی جاتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ طلاق مکرہ نہ جد (واقعیت) ہے نہ ہزل (مذاق)، "ہزل" تو متفقاً نہیں ہے، جد اس لیے نہیں کہ "جد" نام ہے خواہش

حقیقی و واقعی کے اظہار کا جو بحالت اکراہ غیر ممکن ہے! بالآخر یہ معاملہ جناب مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا، مفتی صاحب نے استدلال عقلی کے طور پر فرمایا کہ زبان سے لفظ طلاق ادا کرنا انسان کا ایک فعل ہے اور افعال کا اثر محتاج نیت وارادہ، واظہار واقعیت و غیر واقعیت نہیں ہے مثلاً کسی کو تم طمانچہ مارو جو تمہارے ہاتھ کا ایک فعل ہے تو اس کا اثر یعنی چوٹ اور صدمہ محسوس ووا قع ہوگا، خواہ مارنے کے لیے تمہارا ارادہ و خواہش واقعی ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح لفظ طلاق کے نطق کا جو اثر ہے وہ ہر حال میں واقع ہوگا۔ اس استدلال کو سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا، لیکن پھر علی الفور خدا نے مجھے ایک جواب القا کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ افعال کے آثار دو قسم کے ہیں، اعتباری و واقعی، وہ جو ہماری تسلیم و اعتبار پر موقوف نہ ہو بلکہ وہ حقیقتاً بلا اعتبار معتبر ہو مثلاً ضرب کے لیے احساس صدمہ، دوسرا صرف اعتباری، اگر اعتبار کیجئے تو اثر ہے اور نہ اعتبار کیجئے تو اثر نہیں ہے مثلاً ایک مجنون کے لفظ طلاق کے ساتھ حرکت زبان۔ اگر شرع اعتبار کرے تو طلاق ہے نہ اعتبار کرے تو طلاق نہیں ہے، اس لیے بجائے استدلال عقلی کے صرف یہ ثابت کرنا چاہیے کہ مکرہ کے اس فعل کے اس اثر کو شریعت اعتبار کرتی ہے یا نہیں اور اس کا فیصلہ حدیث عائشہؓ نے کر دیا کہ نہیں کرتی ہے[1]

ایک اور بات۔ اکثر فقہاء نے مدات زکوٰۃ والی آیت إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ[2] الخ میں فِي سَبِيلِ اللَّهِ سے مراد صرف جہاد بالسیف لیا ہے اور لِلْفُقَرَاءِ کے لام کو لام تملیک قرار دیا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک یہ تحدیدات درست نہیں

---

[1] علامہ سید سلیمان ندوی: حیات امام مالک، کراچی ۱۹۶۰ء۔ حاشیہ ص ۵۸-۵۹ [2] سورۂ توبہ، آیت ۶۰۔

فی سبیل اللہ میں ہر دینی کام شامل ہو سکتا ہے اور للفقراء کے لام کو لام انتفاع لینا چاہیے۔ سیرۃ النبی جلد پنجم میں اس مقام پر یہ بصیرت افروز حاشیہ سپرد قلم فرمایا ہے:-

"اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، ابھی آیت گزر چکی، لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[الف] اس سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے۔ اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملک بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا[ب]"

حضرت علامہ کی یہ توضیح فرنگی دور غلامی میں چاہے ہمارے علماء کے لیے ناقابل اعتنا رہی ہو مگر آج پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں ترویج زکوٰۃ کے مرحلہ پر اس کی اہمیت اور افادیت پر اگر توجہ نہ دی گئی تو محض ایک روایتی تعبیر پر اصرار کی وجہ سے صرف زکوٰۃ کا دائرہ اپنے ہاتھوں محدود ہو کر رہ جائے گا اور دوسری طرف اہل مدارس کی چلائی ہوئی "حیلۂ تملیک" کی قباحت کو قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

صوفیانہ مسلک | حضرت علامہ کا گھرانہ خانوادۂ نقشبندیہ سے منسلک تھا اور خود علامہ کی ابتدائی روحانی تربیت ان کے برادر بزرگ سید ابو حبیب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر ہوئی تھی جو قطب وقت شاہ ابو احمد بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور ذوق اتباع

سلسلہ الف۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۳، علامہ سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی (مقدمہ) اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء اشاعت دوم ص ۳۳۰، ب سورۂ بقرہ آیت ۲۹۔

سنت میں مثال تھے، لازماً اتباع سنت کا یہی نکھرا ہوا ذوق علامہ کے قلب و دماغ نے بھی قبول کیا۔ دوسری طرف علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی اپنے اس جواں عمر شاگرد عزیز کے ساتھ یہی معاملہ فرمایا کہ بقول حضرت سلیمانؒ :-

" اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت سرور کائنات، فخر موجودات رحمت عالم، سید اولاد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکار اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے سب سے اول پہنچایا"[1]

راست اتباع نبویؐ کا یہ ذوق متوجہ بہ تصوف ہوکر اور زیادہ تیز ہو گیا تھا، اس کا اظہار اپنے دوسرے عریضہ میں مرشد تھانویؒ سے ان الفاظ میں کیا ہے :-

" امام ربانی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ سے عقیدت تامہ رکھتا ہوں، خرافات و طامات صوفیہ کے دل سے منکر ہوں۔ صالح نہیں لیکن صلاح حال کا دل سے خواستگار ہوں"[2]

حضرت اقدس تھانویؒ نے درمیانی جملہ کی بابت اپنے رنگ کا اظہار یوں فرمایا ہے:

" صوفیہ کے احوال و اقوال کو محتمل تاویل سمجھتا ہوں الا من تحقق بطلانہم بالقطع"[3]

بہر حال اس نقشبندی جوہر کا چشتی اشرفی بھٹی کی آگ میں پھنک کر جو کشتہ تیار ہوا تو اس میں ایک انفرادیت اور صوفیانہ مسلک کا وہ نکھار پیدا ہوا کہ وہ ٹھیک سلف اولین والی جلا سے مجلیٰ ہو گئے۔ حضرت علامہ کے مسلک احسانی کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔

(۱) وحدۃ الوجود ہو کہ وحدۃ الشہود ان میں سے کوئی چیز مدار طریق نہیں، بعض

---

[1] علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ حیات شبلی (مقدمہ) اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۱۱ [2] تذکرہ سلیمان ص ۱۰۰ [3] ایضاً ص ۱۰۲۔

حال کا درجہ رکھتے ہیں (جیسے وحدۃ الوجود و شہود) اور بعض محض افلاطونی فلسفہ کی تبدیل شکلیں (جیسے تنزلاتِ ستہ) لہذا ان کی طرف توجہ نہ ہونی چاہیے۔

(ب) صرف توحید تنزیہی مطلوب ہے۔ تشبیہ کا انکار نہ ہو مگر تشبیہ میں بھی تنزیہ کا اقرار رہے (لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ)

(ج) توحید افعالی پر تمام تر توجہ مرکوز رہنی چاہیے، قرآن پاک نے سارا زور توحید افعالی پر دیا ہے، توحید ذاتی تک رسائی کا یہی محفوظ زینہ ہے۔

(د) کثرت وظایف و اوراد کے بجائے ہر عمل میں اتباع سنت اور ہر عمل سے متعلقہ ادعیہ ماثورہ کی پابندی پر توجہ مرکوز رہے، اسی سے وصول الی اللہ حاصل ہوتا ہے۔

(ہ) مصطلحات صوفیانہ کو ترک کر کے قرآنی وحدیثی اصطلاحات پر اکتفا ہے۔

(جیسے خشوع، خضوع، تقویٰ، خشیت، ذکر، احسان وغیرہ)

(و) صوفیانہ مسائل کی بحث و تحمیص اور قیل و قال سے احتراز کا اہتمام اور اپنے اقوال، اعمال، احوال اور اذواق کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ہم رنگ بنانے کی کوشش بلیغ رہنی چاہیے۔

(ز) اسرار و حقایق الٰہیہ سے متعلق جو سوالات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے نہیں اٹھائے وہ ہم کو بھی از راہِ تصوف نہ اٹھانے چاہییں نہ ایسی باتوں میں الجھنا چاہیے۔

(ح) ساری توجہ لطیفۂ قلب پر مرکوز رہے کہ یہی قرآن وحدیث میں مذکور ہے اور ذکر مفرد مع الحضور کی کثرت سے رسوخ اور دوام حضور حاصل کیا جائے تا کہ

فنائے تام حاصل ہو کر مقام عبدیت میں تمکین میسر آجائے جو مقصود ہے اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ جس پر دلیل محکم ہے!

(ط) محاسبۂ نفس کی ہمہ وقتی مشق اور اہتمام تا دمِ آخر قائم رہے۔

اب آخری بات جو صحیح فہم کے نقطۂ نظر سے اولین اہمیت کی چیز ہے کہ حاصل تصوف کیا ہے؟ اس کو خود حضرت علامہ کی زبان عارفانہ میں سنیے۔ اپنے شاگرد عزیز مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ایک والا نامہ میں تحریر فرما رہے ہیں:

"ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے اور جب خدا اور بندے کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو "نسبت" کہتے ہیں اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ[1] اور رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ[2] کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝[3] انہی کے لیے نوید بشارت ہے[4]"

اجتماعیاتی مسلک سب جانتے ہیں کہ حضرت علامہ خالص علمی و تحقیقاتی کاموں کے لیے جوانی ہی سے خود کو وقف فرما چکے تھے، ان کی اسی تنائیت علمی کا ثمرہ ہے کہ ان کی حیات ہی میں دار المصنفین کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا، اس کے باوجود ہر دیکھنے والا یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے اولین اجلاس منعقدہ بمبئی میں اور پھر اس کے دوسرے اجلاس منعقدہ دہلی میں شریک ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں مجلس علمائے بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرما رہے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۵۴ [2] سورۂ انعام، آیت ۱۱۹۔ سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲۔ سورۂ بینہ، آیت ۸ [3] سورۃ الفجر، آیات ۲۷، ۲۸ [4] سید مسعود عالم ندوی "مکاتیب سلیمانی"۔

میں علمائے ہند کی تنہا نمایندگی یورپ میں فرما رہے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں صوبۂ بہار کی خلافت کانفرنس کے اجلاس میں کرسئ صدارت کو زینت بخشے ہوئے ہیں ۱۹۲۴ء میں حجاز اور مصر پہنچکر ابن سعود اور شریف حسین میں کامیاب مصالحت کرا رہے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں جمیعۃ العلمائے ہند کے تاریخی سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کی زمام صدارت ہاتھ میں لیے علمائے کرام کو سمت عمل کی صحیح نشاندہی فرما رہے ہیں، ادھر اسلال کی ضیا پاشیوں میں نور کی کتنی تابناکیاں ہیں جو اسی آفتاب علم کی رہین منت ہیں۔ پھر تحریک پاکستان کے ہونہار دور میں وہی صاحب نظر ہے جو بظاہر الگ تھلگ مگر خاموشی سے "اسلام کا سیاسی نظام" اپنی نگرانی میں مرتب کروا کے لیگیوں کے حوالے کر رہا ہے۔ پھر جب پاکستان بن چکا تو اس کی دعوت پر ۱۹۵۰ء میں یہاں آکر علامہ ہی کی فعّالیت ہے جو مراحل دستور سازی اور تشکیل قانون اسلامی میں کارفرما نظر آتی ہے۔ دوسری سمت دیکھئے تو وہ بالواسطہ دھیمے دھیمے جماعت اسلامی کی باغی کمان کو جادۂ حق پر لانے کی حکیمانہ کوشش فرما رہے ہیں، کبھی دیکھئے تو وہی ہیں جو شان فقر لیے تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں نم دیدہ دست بدعا دکھائی دے رہے ہیں اور زعمائے تبلیغ کو وسعت فکر و عمل کی وصیت فرما رہے ہیں۔ غرض خلوت پسندی اور اجتماعی جد و جہد میں عجیب دل کش و دل فریب ربط پیدا کیے ہوئے ہے۔ یہی حضرت علامہ کے اجتماعی مسلک کا امتیاز ہے جو دراصل قرآن پاک کی دو آیات پر اپنی اساس قایم کیے ہوئے تھا ایک تو وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ[1] (یعنی ہر تقویٰ اور نیکی کے معاملہ بے تعاون) اور دوسرے

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۲۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا[1] (یعنی اپنی خدمات میں مخلوق کی طرف سے جزا یا قدردانی کے صلہ سے بے نیازی) اسی لیے حضرت علامہ کے مسلک اجتماعی میں بڑی ہمہ گیری تھی۔ ان کا اجتماعیاتی مسلک آویزش و محاذ آرائی کی تلخیوں سے پاک، منصب و جاہ کی حرص اور نمود و شہرت کی نفسانی خواہشات سے منزہ تھا۔ یہاں کسی خاص جماعت میں نہ انضمام تھا نہ کسی سے انقطاع بلکہ انضمام و انقطاع کے درمیان "بے غرض تعاون" تھا، جو صرف امت محمدیہ سے محبت اور اس کی دل سوزی کے محرکات اور صرف اور صرف رضائے الٰہی کی طلب کے اضطراب قلبی کا نتیجہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کی ہزار رحمتیں اور نوازشیں ہوں ایسے پاکیزہ مسلک حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی روح پر فتوح پر!

---

[1] سورۂ دہر، آیت ۹۔

حیاتِ سلیمانؒ

(مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم)

مولانا سید سلیمان ندوی کی سوانحعمری جس میں انکے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی و سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع پیش کیا گیا ہے، اس کتاب میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا تمام اہم ملی، سیاسی اور علمی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی اور مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے۔

دارالمصنفین کی تاسیس اور سال بہ سال اسکی ترقی کی روداد کے ساتھ سید صاحب کے سفر بھوپال اور ہجرت پاکستان کی بھی تفصیل کی گئی ہے۔   قیمت ۵۰ روپے۔

حفظانِ صحت کے اسلامی اصول اور جدید تحقیقات

از ڈاکٹر حافظ محمود اختر، لاہور

(۲)

روزہ ایک عظیم الشان عبادت ہے جس کے طبی فوائد مسلم ہیں، یہ معدے کے امراض اور بدن کے گندے مواد کے خاتمہ کے لیے ایک مستقل نسخہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے"[۲۶] زکوٰۃ مال کو پاک وصاف کرتی ہے اور روزہ انسانی جسم کو مادی اور روحانی بیماریوں سے نجات دلانے کا ذریعہ ہے۔

اطبا نے بھی بعض امراض میں انسان کو کچھ دیر کے لیے پیٹ خالی رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ایک روسی ماہر ابدان پروفیسر دی این نکیٹن نے لمبی عمر کا راز بھی اسی میں مضمر بتایا ہے۔ لندن میں ۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر میرے تحقیق شدہ یہ تین اصول زیرِ عمل آجائیں تو بدن کے زہریلے مادے خارج ہوکر بڑھاپا کو روک سکتے ہیں۔

۱۔ خوب محنت ۲۔ کافی ورزش ۳۔ غذا کچھ بھی ہو لیکن ہر ماہ ایک مرتبہ لازماً فاقہ[۲۷]

کتب حدیث میں "صیام التطوع" "یعنی نفلی روزے" کے باب کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر دکھائی دے گی کہ حضور اکرمؐ نے ہر ماہ میں تین روزوں کی

بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے[48]۔ دوسری جانب روزے فرض بھی قرار دیے گئے ہیں لیکن کسی طرح کے روزے میں کوئی افراط و تفریط نہیں ہے، مسلسل روزے سے انسانی جسم نقاہت کا شکار ہو جاتا ہے، رہے روزے کے اوقات تو ان کی مدت کے تعین میں کمال حکمت کا اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:-

"روزے کے دنوں کی تعداد میں ایک حکمت کارفرما ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہے' اگر تفریط ہوتی یعنی بہت کم دنوں کے روزے فرض کیے جاتے تو روزہ کا اصل مقصد ہی حاصل نہ ہوتا اور اگر افراط کی راہ اختیار کی جاتی اور روزے زیادہ لمبے عرصے کیلئے لازم کیے جاتے تو اس سے انسانی قویٰ و اعضاء میں خرابی پیدا ہو جاتی، کام کرنے کی استعداد پر منفی اثرات پڑتے اور انسان اتنا کمزور ہو جاتا کہ جیتے جی قبر میں پاؤں لٹکا لیتا ہے[49]"

اسی طرح کھانے پینے سے رکے رہنے کا وقفہ بھی اس قدر طویل نہیں ہے کہ انسانی جسم میں کمزوری ہو جائے اور انسان دینی و دنیوی فرائض کی ادائی سے قاصر ہو جائے[50]۔

حضورؐ کی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایسے طبی اصول کی رعایت کی گئی ہے جن سے انسانی جسم کمزوری کا شکار نہ ہو۔ مثلاً حضورؐ نے روزہ کی حالت میں سینگیاں لگانے اور لگوانے سے متعدد حدیثوں میں اسی لیے منع کیا ہے کہ سینگی لگوانے والے پر کمزوری طاری ہو سکتی ہے اور سینگی کھینچنے والا روزہ سے اس لیے ہاتھ دھو بیٹھا کہ وہ سینگی چوستے وقت اس بات کے قریب ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے منہ میں چلی جائے، آپؐ نے رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں مسلسل روزے رکھنے کی ممانعت یا حوصلہ شکنی فرمائی ہے[51]۔ غرض روزہ جیسی اہم عبادت کا طریقہ ایسا بیان

کیا گیا ہے جس سے مثبت اثرات مرتب ہوں اور منفی اثرات سے بچا جاسکے۔ انسان صحت مند ہو تو وہ دنیوی فرائض بھی سرانجام دینے کے قابل ہوگا اور عبادت میں انہماک بھی اسی وقت رہیگا جب وہ جسمانی اعتبار سے توانا ہوگا۔[۵۲]

اسلام کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کے اندر راہبانہ تصور زندگی پایا جاتا ہے ' ہندومت اور بدھ مت میں بھوکے پیاسے رہ کر جسم کو کمزور اور لاغر بنالینا تزکیۂ نفس کی علامت سمجھا جاتا ہے ، اس قسم کی انتہا پسندانہ ریاضتیں اور مشقتیں انسانی جسم کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں جو ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے ، اسلام کا کمال یہ ہے کہ وہ تزکیۂ نفس بھی کرتا ہے اور انسانی صحت کی بہتری اور حفاظت کا سامان بھی کرتا ہے ۔

کھانے پینے کی اشیاء کو ڈھانپ کر رکھنے کی ہدایت اسی لیے دی گئی ہے کہ کھلی چیزوں میں مکھی، مچھر، چیونٹی یا گرد و غبار وغیرہ پڑ جاتے ہیں ۔ اگر ان کے ساتھ کوئی زہریلا مادہ لگا ہو تو وہ انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہوگا ۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ابو حمید انصاری مقام نقیع سے حضور اکرمؐ کے لیے دودھ کا برتن لائے آپؐ نے فرمایا تم اسے ڈھانپ کر کیوں نہیں لائے۔[۵۳] ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا بسم اللہ پڑھ کر اپنی مشک بند کر دو اور بسم اللہ پڑھ کر اپنے برتن ڈھانپ دو۔[۵۴]

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تم سونے لگو تو اپنے چراغ بجھا دیا کرو ۔ کیونکہ چوہے رات کو دیے کی بتی کھینچ لیجاتے ہیں اور گھر کو آگ لگا دیتے ہیں۔[۵۵] حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ حضورؐ نے پانی پیتے وقت اس میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ۔ ایک شخص نے عرض کیا اگر اس میں تنکے پڑ جائیں ؟ آپؐ نے فرمایا

ہوڑا سا پانی چھینک دو۔[۵۵]

حضورؐ نے مشک میں منہ لگا کر پانی پینے سے بھی منع فرمایا اس کے مصالح حضرت شاہ ولی اللہ نے یہ بیان کیے ہیں۔

۱۔ اس طرح سے کئی بار پانی پینے والے کی سانس اندر جا کر مشروب کو مسموم ومکروہ بنا دیتی ہے۔

۲۔ پانی کا ایک حصہ اس کے جوف میں داخل ہوکر ضرر رساں بن جاتا ہے۔

۳۔ کبھی اس میں کوئی مکھی مچھر یا کوئی اور جانور گر پڑتا ہے جس کا پتہ پیتے وقت نہیں چل سکتا اور اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔

۴۔ کبھی پانی میں تنکے وغیرہ گر پڑتے ہیں جو پیتے وقت نظر نہیں آتے اور پیٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ عین ممکن ہے کہ مشک کا منہ اچانک زیادہ کھل جانے سے پانی سانس والی نالی کے اندر چلا جائے اور مشاہدہ یہ ہے کہ اس صورت میں آدمی کی حالت غیر ہو جاتی ہے[۵۶] شاہ صاحب فرماتے ہیں:

" پانی غٹ غٹ کرکے یکبارگی حلق میں داخل کرنے سے درد جگر پیدا ہوتا ہے جو معدہ کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور چونکہ اس طرح پانی پینے سے مشکیزہ نظر سے اوجھل رہتا ہے اس لیے کوئی بھی موذی اور مکروہ چیز اس کے شکم میں جا سکتی ہے چنانچہ ایک شخص نے اس طرح پانی پیا، مشکیزے میں سانپ تھا جو پانی کے ساتھ ہی اس کے اندر چلا گیا[۵۷]"

پانی وغیرہ میں پھونک مارنے سے منع فرمانے کی حکمت یہ ہے کہ پھونک کے

ساتھ منہ یا اس کی ناک سے پانی میں ایسی چیز گر جائے جس سے طبیعت ابا کرتی ہو اور وہ موجب ضرر ہو۔ بخاری اور مسلم شریف میں روایت ہے۔

عن انس قال کان رسول اللہ	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ
صلی اللہ علیہ وسلم یتنفس	حضور اکرمؐ پیتے وقت تین دفعہ
فی الشراب ثلثاً۔	سانس لیا کرتے تھے۔

مسلم شریف کی روایت میں اس کے بعد یہ اضافہ ہے۔

یقول انہ اروی وابرأ	اس طرح سانس لینے سے زیادہ
وامرأ	سیرابی حاصل ہوتی ہے، یہ زیادہ
	صحت بخش ہے اور معدہ کے لیے زیادہ
	خوش گوار ہے۔

پانی پینے کے دوران تین بار سانس لینا حضور اکرم صلعم کا معمول مبارک تھا۔ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کے لیے حجۃ اللہ البالغہ ملاحظہ ہو (جلد دوم ص۲۹)

در حقیقت حضور اکرمؐ کی ہر سنت کے اندر کوئی نہ کوئی حکمت مضمر ہوتی ہے خواہ وہ عام لوگوں کو نہ معلوم ہو محسوس ہو، اس طرح سنت پر عمل پیرا ہونا باعثِ خیر و برکت بھی ہے اور ضرر سے تحفظ کا ذریعہ بھی ہے۔

جان کی حفاظت کے لیے دفعِ مضرت کے متعلق بھی ہدایات دی گئی ہیں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
علیہ وسلم من بات وفی	فرمایا جو کوئی رات کو اپنا ہاتھ دھوئے

ید ہ غمر لم یغسلہ فاصابہ شیئ فلا یلومن الا نفسہ[۷۲]	بغیر اس طرح سو جائے کہ ہاتھ پر چکنائی کا اثر اور اس کی بو باقی رہ گئی ہو اور اس کی وجہ سے کوئی گزند پہنچ جائے (جیسے کوئی کیڑا کاٹ لے) تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (کیونکہ یہ اسی کی غفلت سے ہوا ہے)

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اپنا یہ معمول بیان کرتی ہیں کہ جب ثرید پکا کر ان کے پاس لائی جاتی تو وہ اس وقت تک ڈھکی رکھی جاتی تھی جب تک کہ اسکی گرمی ختم نہ ہو جاتی۔ اس کے بعد ہی وہ اسے تناول فرماتیں اور کہتیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے سُنا ہے کہ ٹھنڈا کر کے کھانا زیادہ برکت کا باعث ہے[۷۳]۔ یہی طبی اصول بھی ہے کہ کھانا زیادہ گرم نہ کھایا جائے، صاحب کنز العمال نے اس سلسلہ کی متعدد احادیث جمع کر دی ہیں۔

صحت اور جان کی حفاظت کے سلسلہ میں یہ امور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:۔

۱۔ اِذا کان احدکم فی الفیئ فقلص عنہ الظل فصار بعضہ فی الشمس وبعضہ فی الظل فلیقم[۷۴]	جب کوئی سایہ کی جگہ پر بیٹھا ہو پھر اس پر سے سایہ ہٹ جائے اور اس کے جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں رہ جائے اور کچھ حصہ سائے

میں تو اسے چاہیے کہ وہ اس جگہ
سے اٹھ جائے۔

ماہرین کے خیال میں یہ اصول طب کے اعتبار سے بھی مفید ہے۔

۲۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایسی چھت پر سونے سے منع فرمایا جو دیواروں اور منڈیروں سے گھری ہوئی نہ ہو[۶۵] حضرت علی بن شیبانؓ سے بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو شخص کسی گھر کی چھت پر سوئے جس پر پردہ اور رکاوٹ نہ ہو تو اس پر سے اللہ کی ذمہ داری ختم ہو گئی[۶۶] اس میں پڑوسیوں کی بے پردگی کے علاوہ جان کی ضیاع کا اندیشہ بھی ہے۔

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک میں نے ارادہ کیا تھا کہ ایام رضاعت میں عورتوں کی مقاربت سے امت کو منع کر دوں[۶۷]۔ ایک دوسری حدیث میں اسی بات کو اس پیرایہ میں کہا گیا ہے کہ پوشیدہ طور پر اپنی اولاد کے قتل کا باعث نہ ہو[۶۸]۔ اس کی شرح میں شاہ ولی اللہ صاحب رقمطراز ہیں

"اس کی وجہ یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت سے جماع اس کے دودھ کو ضرر رساں بنا دیتا ہے اور اس کی وجہ سے بچہ کمزور ہو جاتا ہے۔ شیر خوارگی کے دوران میں صحت پر پڑنے والے مضر اثرات بچے کے جوان ہو جانے تک موجود رہتے ہیں[۶۹] ....

اول الذکر حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ لیکن میں نے دیکھا کہ اہل روم وفارس میں یہ فعل مروج ہے پھر بھی ان کے بچوں کو نقصان نہیں پہنچتا اس لیے میں نے اس پر پابندی لگانے کا فیصلہ ترک کر دیا۔

گستاولی بان لکھتے ہیں:

"عربوں نے حفظِ صحت کے علم کو نہیں چھوڑا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس علم کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو ان امراض سے محفوظ کر سکتا ہے جو علاج سے اچھے نہیں ہوتے۔ ابتدائے زمانہ عربوں کی عادات حفظ صحت بہت عمدہ تھیں۔ احکام قرآن میں غسل، وضو اور ترک شراب پر اصرار اور گرم ملکوں میں نباتی غذاؤں کو حیوانی غذاؤں (گوشت) پر ترجیح دینا نہایت عاقلانہ اور مفید اصول ہیں اور صحت کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات ارشاد فرمائی ہیں ان پر کسی طرح بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں کے حفظان صحت کے اصول و قواعد ملفوظات کی شکل میں ہیں جس کی بنا پر وہ آسانی کے ساتھ یاد ہو جاتے ہیں[۲۹]"

۴۔ حضور اکرم صلعم نے فرمایا دو نعمتیں ہیں جن کے بارے میں لوگ بڑے گھاٹے میں ہیں ایک صحت دوسری فراغت یعنی لوگ ان کی قدر نہیں کرتے[۳۰]

آپؐ نے فرمایا پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے قبل صحت کو، افلاس سے قبل خوشحالی کو، مشاغل سے پہلے فراغت کو اور موت سے پہلے زندگی کو[۳۱]

حضورؐ نے فرمایا جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اپنی جان کی طرف سے بے خوف ہو، اس کا بدن درست ہو، ایک دن کے کھانے کا سامان اس کے پاس موجود ہو تو اس شخص کے لیے گویا دنیا کی نعمتیں جمع کر دی گئی ہیں[۳۲]

ناخن ترشوانا۔ ختنہ۔ بیویوں سے جنسی تعلق میں اعتدال، جوتا جھاڑ کر پہننا۔

زیادہ گرم اور زیادہ ٹھنڈی اشیاء کھانے سے احتراز، کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرنا۔ کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرنا، ریح کے اخراج کو نہ روکنا اور اس نماز کو مکروہ قرار دینا جس میں اخراج ریح کو جبراً روکا جا رہا ہو، ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں ہاتھ نہ ڈالنا، دھوپ میں گرم کیا ہوا پانی استعمال نہ کرنا۔ نہار منہ پانی استعمال نہ کرنا۔ کسی برتن کے ٹوٹے ہوئے حصہ سے پانی نہ پینا، گرم اور سرد چیز کا یکے بعد دیگرے استعمال نہ کرنا، روزہ کھولتے وقت نمک استعمال کرنا وغیرہ اس طرح کے تمام احکام میں انسانی صحت کا راز مضمر ہے۔

حواشی

۴۶ بحوالہ فارانی، فضل کریم، اسلامی اصول صحت، صفحہ ۳۰ ۴۷ دیکھئے مثلاً مشکوٰۃ، جلد دوم صفحہ ۴۲-۴۳۵ (صیام التطوع) ۴۸ و ۴۹ و ۵۰ ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، صفحہ ۲۹۳، ۵۰ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، دمشق، جلد دوم، صفحہ ۴۳۵ (باب صیام التطوع) ۵۱ دیکھئے ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، صفحہ ۹۴-۲۹۲ (اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم) ۵۲ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ، دمشق، جلد دوم، صفحہ ۴۶۹ (باب تخطیۃ الاوانی وغیرھا، حدیث ۴۲۹۹ ۵۳ بخاری، امام، الجامع الصحیح، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱ (باب بدء الخلق) ۵۴ ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۱۱ (باب کراھۃ التنفس فی نفس الاناء ....) ۵۵ ایضاً ۵۶ ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، صفحہ ۳۹-۴۰، ۵۷ ایضاً جلد دوم، صفحہ ۴۹، ۵۸ ایضاً ۵۹ و ۶۰ بحوالہ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، دمشق، جلد دوم، ۴۴۳ ۶۱ و ۶۲ مشکوٰۃ کتاب الطب فصل ثالث ۶۳ و ۶۴ و ۶۵ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، جلد دوم صفحہ ۱۹۰ ۶۶ و ۶۷ و ۶۸ ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، صفحہ ۵۹۰ (اردو ترجمہ مولانا عبدالرحیم ۶۹ لی گستاولی بان، تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی، ظفر ٹریڈرز سرگودھا صفحہ ۴۵۲ ۷۰ و ۷۱ و ۷۲ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ، دمشق، ۱۹۶۱، جلد دوم، صفحہ (کتاب الرقاق)

مشرقی یورپ کی ایک مظلوم مسلم ریاست
بوسنیا و ہرزیگووینا

از محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین

(۲)

برلن میمورنڈم روس اور آسٹریا ایک طرف تو خفیہ انقلابی کمیٹیوں کے ذریعہ سے بلقان کے ہر صوبہ میں بغاوت پھیلا رہے تھے اور دوسری طرف دول عظمیٰ کی طرف سے دباؤ ڈال کر باب عالی سے باغیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے، اندراسی نوٹ کے بعد ۱۱ مئی ۱۸۷۶ء کو روس کے پرنس گورچاکوف، آسٹریا سے کاؤنٹ اندراسی اور پرشا کا پرنس بسمارک نے برلن میں دوبارہ میٹنگ کی اور باب عالی میں بھیجنے کے لیے ایک دوسرا میمورنڈم مرتب کیا جو برلن میمورنڈم کے نام سے مشہور ہے، اس میمورنڈم میں مندرجہ ذیل مطالبات کیے گئے تھے۔

۱۔ بوسنیا و ہرزیگووینا میں بغاوت کے نتیجے میں منہدم کیے گئے تمام مکانات کی دوبارہ تعمیر باب عالی کرائے۔ کاشتکاروں کے لیے زراعت کے وسائل و اسباب مہیا کیے جائیں اور تین سال کا ٹیکس بھی معاف کر دیا جائے۔

۲۔ بوسنیا وہرزیگوینا کے لیے مسلمان اور عیسائی ارکان پر مشتمل ایک مخلوط کمیشن بٹھایا جائے جس کا صدر ایک مقامی عیسائی ہو۔

۳۔ بوسنیا وہرزیگوینا سے ترکی فوجیں ہٹائی جائیں بجز دس متعین قلعوں کے۔

۴۔ جب تک وہاں اصلاحات مکمل طور پر نافذ نہ ہوجائیں اور امن وامان ازسرنو قائم نہ ہوجائے عیسائیوں کو ہتھیار کے استعمال کی اجازت دی جائے۔

۵۔ دول عظمیٰ کے سفیروں اور نمایندوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی نگرانی میں یہ مطالبات پورے کرائیں۔

آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر فوجی کارروائی موقوف کرکے دو ماہ کی مدت میں یہ مطالبات پورے نہ کیے گئے تو سلطنت عثمانیہ کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائیگا۔

برلن میمورنڈم سے فرانس اور اٹلی نے بھی اتفاق کیا، صرف حکومت برطانیہ کو اس بنا پر اختلاف تھا کہ روس، آسٹریا اور پرشا نے اس سے مشورہ کیے بغیر اس کو مرتب کرلیا تھا۔

ترکی کا دستور اساسی اور قسطنطنیہ کانفرنس | ۱۲ / شعبان سنہ ۱۲۹۳ھ (یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۶ء) کو سلطان عبدالحمید خاں ثانی سلطنت عثمانیہ کے فرماں روا مقرر ہوئے۔ انکی تخت نشینی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ ترکی کے بنیادی آئین کا اعلان کریں گے چنانچہ ۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۷۶ء کو ترکی کے دستور اساسی کا اعلان کردیا گیا، اس دستور کے رو سے ایک پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا جو دو ایوانوں پر مشتمل تھی، دارالاعیان اور دارالمبعوثین دارالاعیان کے ممبروں کا انتخاب نامزدگی کے اصول پر اور دارالمبعوثین کے ممبروں کا کثرت رائے سے ہونا طے پایا، پارلیمنٹ کے ماتحت ایک وزارتی کابینہ بھی قائم

کی گئی، سلطان کی تمام رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت برابر کے حقوق دیے گئے اور حکومت کے عہدے بھی سب کے لیے یکساں طور پر کھولے گئے، دستور میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ سلطنت کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک قانون نافذ کیا جائے، اس کے علاوہ اس میں جلسوں اور پریس کی آزادی، عدل و انصاف کے قیام اور جبری تعلیم کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔

دستور کے اس اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا، مگر یورپین حکومتوں کو یہ چیز پسند نہ آئی، کیونکہ اس سے سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں انکی مداخلت کا سدباب ہو رہا تھا۔

۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو عین قانون اساسی کے اعلان کے روز ہی قسطنطنیہ میں دول عظمی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کی ابتدائی کارروائی ابھی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارے سے دستور اساسی کے اعلان کی خوشی میں توپوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کانفرنس میں سلطنت عثمانیہ کی نمائندگی صفوت پاشا کر رہے تھے جو اس وقت سلطنت کے وزیر خارجہ تھے، انھوں نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کر کے کہا کہ "توپوں کی جو آواز آپ لوگ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے قانون اساسی کے اعلان کی دلیل ہے اور یہ قانون بلا استثنا، سلطنت کے تمام لوگوں کے حقوق و حریت کا کفیل ہے، کانفرنس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا، اب اس کا انعقاد اور اسکی کارروائیاں فضول ہیں"۔

صفوت پاشا کی اس تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا، کیونکہ اب سلطنت عثمانیہ

کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا، مگر تھوڑی دیر بعد روسی سفیر جنرل اگنا تیف نے جو جمیعہ سلاوی کا رئیس اعظم اور سلطنت عثمانیہ کا بدترین دشمن تھا مہر سکوت توڑا اور یہ تجویز رکھی کہ کانفرنس کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیے چنانچہ کانفرنس کی کارروائی اگنا تیف ہی کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبۂ بلغاریا کو خود مختاری دی جائے، وہاں ایک عیسائی حکمراں مقرر کیا جائے اور ایک قومی فوج قائم کی جائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی جائیں اور بوسنیا و ہرزیگو وینا کے لیے بھی اسی قسم کے مطالبات پیش کیے گئے۔

دستور اساسی کے اعلان کے بعد بھی اس طرح کی تجویز سلطنت عثمانیہ کے داخلی معاملات میں صریح مداخلت تھی، چنانچہ ترک نمائندوں نے اس کی مذمت کی، بالآخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد دول عظمی کے نمائندوں کی جانب سے کم سے کم جو مطالبہ پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ مقامی حکام کی مدد کے لیے ایک سفارتی کمیشن مقرر کیا جائے اور بلغاریا، بوسنیا و ہرزیگو وینا کے صوبوں کے حکمراں دول عظمی کی منظوری سے مقرر کیے جائیں اس میں اس کی بھی صراحت تھی کہ اس مطالبہ میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا، ترک نمائندوں کے نزدیک یہ تجویز بھی قابلِ قبول نہ تھی، مگر دول عظمی کے نمائندوں نے اس تجویز کو ایک الٹی میٹم کی شکل میں باب عالی کو بھیجا اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا قابل اطمینان جواب نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے۔

اسکے بعد مدحت پاشانے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی، جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمائندے شریک کیے گئے اور ان کے سامنے کانفرنس کی یہ تجویز

لی گئی، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف لفظوں میں کہدیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کر دی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، مجلس کے نمائندوں نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا اور متفقہ طور پر دول عظمی کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کر دیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ دول عظمی کے نمائندوں کی یہ مداخلت سلطنت کی غیر مسلم رعایا کی ہمدردی کے نام پر تھی جبکہ صورت حال اس سے بالکل الگ تھی، چنانچہ اس نازک موڑ پر مجلس عالیہ کے تمام نمائندے مسلمان، عیسائی اور یہودی سب ہی متفق و متحد تھے اور سلطنت عثمانیہ کی ماتحتی میں جنگ لڑنے کے لیے آمادہ تھے، مجلس عالیہ کے اس فیصلہ کی اطلاع باب عالی سے دول عظمی کے نمائندوں کو دیدی گئی اور ۲۰ جنوری ۱۸۷۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے۔

روس سے جنگ ادھر دول عظمی کے نمائندے قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے ادھر روس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی، وہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، ۲۴ اپریل ۱۸۷۷ء کو اس نے سلطنت کے خلاف باضابطہ جنگ کا اعلان کر کے اپنی فوجوں کو عثمانی سرحدوں میں داخل ہونے کا حکم دیدیا، اس موقع پر زار روس نے شاہ آسٹریا سے ملاقات کر کے یہ معاہدہ کیا کہ اس جنگ میں آسٹریا اگر غیرجانبدار رہا تو فتح کی صورت میں بوسنیا و ہرزگووینا اس کے حوالہ کر دیے جائیں گے، تقریباً ایک سال تک سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ کا سلسلہ قائم رہا۔

معاہدہ سان اسٹیفانو ۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ سان اسٹیفانو کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ میں

منجملہ اور شرائط کے روس اور آسٹریا کی نگرانی میں بوسنیا و ہرزیگووینا میں ان اصلاحات کو فوراً نافذ کیے جانے کا وعدہ کیا گیا جو قسطنطنیہ کانفرنس میں پیش کی گئی تھیں۔

معاہدۂ برلن | معاہدۂ سان اسٹیفانو کی بہت سی دفعات سے یورپین ملکوں کو اختلاف تھا، خود آسٹریا بھی اس کا شدید مخالف تھا، کیونکہ جنگ سے پہلے روس سے اس کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے وہ بوسنیا و ہرزیگووینا پر اپنا فوجی قبضہ رکھنے کا دعویدار تھا، غرض ہر طرف سے معاہدۂ سان اسٹیفانو کی مخالفت کی بنا پر ۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو دول عظمیٰ کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس برلن میں منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں معاہدۂ سان اسٹیفانو کی بہت سی دفعات تبدیل کر دی گئیں اور ایک ماہ کی بحث و مباحثہ کے بعد ۱۲ جولائی ۱۸۷۸ء کو ایک جدید معاہدہ مرتب ہوا جو معاہدۂ برلن کے نام سے مشہور و معروف ہے، اس نے تقریباً یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد اس کے بہت سے صوبے خود مختار ہوگئے اور اس کے رو سے بوسنیا و ہرزیگووینا غیر متعینہ مدت کے لیے آسٹریا کے حوالہ کر دیے گئے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا پر آسٹریا کا قبضہ | بوسنیا و ہرزیگووینا معاہدۂ برلن کی رو سے گو آسٹریا کو دیدیے گئے تھے، مگر بالفعل یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں شامل تھا، دسمبر ۱۹۰۱ء میں سلطنت عثمانیہ کے انقلابیوں کی ایک کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی جس میں یہ طے کیا گیا کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا جائے اور ترکی میں جمہوری حکومت قائم کر دی جائے، بالآخر ۱۹۰۸ء میں انقلابیوں کی انجمن "اتحاد و ترقی" کے شدید اصرار اور ملک میں بغاوت کے اندیشہ کی بنا پر ترکی میں دستوری

حکومت کا اعلان ہو گیا اور سلطنت عثمانیہ کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

جمہوریت کے اعلان کے بعد ترکی کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر بوسنیا و ہرزیگووینا تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے انہیں اب بھی استبداد کی زنجیروں سے رہائی نصیب نہیں ہوئی، ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسنیا و ہرزیگووینا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں، آسٹریا کو اس سے سخت تشویش ہوئی، وہ بوسنیا و ہرزیگووینا کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ تھا چنانچہ ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو اس نے دفعتہً بوسنیا و ہرزیگووینا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ترکی نے اس پر سخت احتجاج کیا مگر یورپ کے مرد بیمار میں اب اتنی فوجی قوت نہ تھی کہ آسٹریا سے بزور بازو اس خطہ کو لے سکے، چنانچہ ترکی نے آسٹریا سے مصالحت کر لی، آسٹریا نے ۲۲ لاکھ پونڈ نقد اور نووی بازار کا علاقہ ترکی کو بوسنیا و ہرزیگووینا کے بدلہ میں واگذار کیا۔

آسٹریا کے عہد حکمرانی میں بوسنیا و ہرزیگووینا کا حال معاہدۂ برلن کی رو سے بوسنیا و ہرزیگووینا کو جب آسٹریا کی نگرانی میں دیا گیا تو اس کی فوجیں وہاں پہنچ گئیں لیکن وہاں کے مسلمانوں نے ان کا جم کر مقابلہ کیا، خاص طور پر سراجیو کے مسلمانوں نے بڑی سخت مزاحمت کی مگر آسٹریائی فوجوں کی جانب سے سخت کارروائی کے نتیجہ میں ان کو پسپا ہونا پڑا، آسٹریا کی نگرانی کے زمانے میں بھی بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمان اپنے آپ کو عثمانی سلاطین کی رعایا سمجھتے رہے، گو آسٹریا کے حکمرانوں نے اس بات کی کافی کوشش کی کہ بوسنیا و ہرزیگووینا میں متحدہ قومیت کا تصور قائم ہو جائے مگر اس میں

وہ ناکام رہے کیونکہ سرب اور کروش اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر ایک دوسرے سے بہت دور تھے اور مسلمانوں کا طبقہ ترکی کو اپنا اصل وطن سمجھتا تھا، چنانچہ بوسنیا و ہرزیگووینا کے بہت سے مسلم خاندان ہجرت کرکے ترکی چلے گئے اور وہیں آباد ہوگئے۔

۱۸۸۲ء میں آسٹریائی حکومت نے مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو اپنی تحویل میں لینے کی غرض سے مجلس علما تشکیل کی اور رئیس العلماء کا عہدہ اختراع کیا، ۱۸۸۳ء میں متعدد مسلمان نمائندوں اور حکومت کے دو نگراں نمائندوں پر مشتمل اوقاف کی ایک مرکزی کمیٹی سراجیوو میں بنائی، دوسری طرف کیتھولک پادری مسلمانوں کو بجبر عیسائی بنانے کی مہم میں لگ گئے۔ بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات میں مسیحی حکومت کی یہ مداخلت منظور نہیں تھی، کیونکہ اوقاف کی مرکزی کمیٹی جو سراجیوو میں بنائی گئی تھی وہ اس وقت تک کسی فیصلہ کو نافذ نہیں کرسکتی تھی جب تک کہ سرکاری نمائندے اس سے متفق نہ ہوں اور اوقاف کے سارے اختیارات اسی مرکزی کمیٹی کی تحویل میں دے دیے گئے تھے، چنانچہ ۱۸۹۸ء میں بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں نے شاہِ آسٹریا کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں اوقاف کے معاملات میں آزادی کا مطالبہ کیا گیا، ۱۸۹۹ء میں انھوں نے مفتی موستر جابیچ کی قیادت میں مذہبی اور تعلیمی آزادی کے لیے جدوجہد شروع کی، جس کی پاداش میں مفتی موستر جابیچ کو ملک بدر کردیا گیا۔

۱۹۰۶ء کے بعد مسلمانوں کی تحریک زیادہ سرگرم ہوگئی، انھوں نے ایک متحدہ اسلامی مرکز بھی قائم کرلیا، غرض مسلسل جدوجہد اور کشمکش کے بعد ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کے اوقاف، معارف اور ان سے متعلق مالی امور کے لیے ایک مجلس کا

قیام عمل میں آیا اور رئیس العلماء کی قیادت میں سراجیو میں ایک مدرسۂ قضاۃ بھی قائم ہوا۔

بوسنیا وہرزیگووینا پر سربیا کے تسلط کی کوشش

بوسنیا وہرزیگووینا کی ہمسایہ ریاست سربیا ہے، جو سلطنت عثمانیہ کی حکمرانی میں تھی، مگر سلطنت کے عہد آخر میں خود مختار ہوگئی تھی، سربیا کے قدیم حکمراں متعدد بار بوسنیا وہرزیگووینا اور بلقان کے دوسرے علاقوں کو فتح کرکے ایک وسیع سرب ریاست بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے، مگر سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی کے بعد ان کا یہ خواب پراگندہ ہو چکا تھا۔

سربیا کی آزادی کے بعد اس کا ایک فرماں روا میخائل سرب نوجوانوں کی تحریک "اوملاذنا" سے متاثر تھا، اس تحریک کا مقصد جنوبی صقالبہ کو سربیا کے زیر تسلط متحد کرنا تھا، اس تحریک کے پس پشت بھی روس ہی کا ہاتھ تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ اس کا مقصد آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال پر قبضہ کرنا تھا، چنانچہ سربیا میں مقیم روسی سفیر ہارٹ وگ نے اس تحریک کو کافی تقویت پہنچائی۔

معاہدۂ برلن کے مطابق بوسنیا وہرزیگووینا جب آسٹریا کی نگرانی میں دیدیے گئے تو سربیا آسٹریا سے نالاں ہوگیا اور اس نے روس سے اپنے تعلقات مضبوط کرلیے، اسی اثناء میں سلطنت عثمانیہ اور بلقانی ریاستوں کے درمیان جنگ بلقان ہوئی، جو تاریخ کی بھیانک جنگوں میں شمار کی جاتی ہے، جنگ بلقان کا اصل محرک سربیا تھا اور سربیا میں یہ روح ہارٹ وگ نے پھونکی تھی، اس جنگ کے نتیجہ میں ۱۰ اگست ۱۹۱۳ء کو بخارسٹ کی صلح کے رو سے سربیا کا رقبہ تقریباً دوگنا ہوگیا، اس سے اپنے حدود مملکت کو وسیع کرنے کی تحریک کو مزید تقویت حاصل

ہوئی، اس نے متعدد انقلابی جماعتیں آسٹریا و ہنگری وغیرہ کے زیر تسلط سلاوی علاقوں پر قبضہ کے لیے تیار کیں جن میں اسکی جمعیت "دست سیاہ" Ruka Crna کو کافی شہرت ملی۔

سرب کروشن سلووان اسٹیٹ کا قیام | ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو سراجیو میں آسٹریا کے ولیعہد فرڈینینڈ اور اس کی بیوی کے قتل کے واقعہ سے جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ اس جنگ کے دوران سربیا نے آسٹریا کے زیر تسلط علاقوں کو حاصل کر لیا، ۴ نومبر ۱۹۱۸ء کو اس نے بلغراد کو فتح کر کے جنوبی صقالبہ پر اپنا قبضہ جما لیا،

جنگ عظیم کے بعد سربیا کا مستقل وجود ختم ہو گیا، اس کے بجائے سرب کروشن سلووان اسٹیٹ کے نام سے ایک نئی ریاست تشکیل دیدی گئی، جس کی سربراہی سربیا ہی کو حاصل تھی، چنانچہ سربیا کا صدر مقام بلغراد اس نئی مملکت کا دار الحکومت اور سربیا کا فرماں روا پیٹر قرہ جارجیورج اس کا پہلا بادشاہ بنا۔ بوسنیا و ہرزیگووینا مقدونیا اور مانٹینگرو وغیرہ کے تمام علاقے اس مملکت میں شامل کر لیے گئے۔ ۲۸ جون ۱۹۲۱ء کو اس مملکت کا آئین منظور ہوا، پھر ۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو سربیا کے حکمراں الکسنڈر نے اپنی آمریت کا اعلان کر کے آئین، پارلیمنٹ اور تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا۔ دوبارہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ایک نئے آئین کا اعلان ہوا اور مملکت کا نام تبدیل کر کے یوگوسلاویہ رکھا گیا۔

کروشیا کا قیام | اس مملکت میں صرف سرب ہی ایک مضبوط مرکز کے علمبردار تھے، ان کے علاوہ بقیہ تمام قومیں نہایت کمزور اور بے بس تھیں اور سب کی سب صوبائی خود مختاری کی طالب تھیں، ان میں کروشن کو چونکہ کیتھولک عقیدہ کی

بنا پر مغربی ملکوں کی تائید حاصل تھی، اس لیے ۱۹۳۹ء میں یوگوسلاویہ کی حکومت نے خود مختار اور داخلی معاملات میں آزاد کروشیا کا مطالبہ منظور کر لیا، جس کے بعد کروشیا کے نمائندے مرکزی پارلیمنٹ میں شرکت پر آمادہ ہو گئے، اس تقسیم کے نتیجہ میں بوسنیا و ہرزیگووینا کا بڑا حصہ کروشیا کے حصہ میں آیا جس کی بنا پر وہاں کے مسلمان کروٹس اکثریت کے زیر نگیں ہو گئے اور ان کا رشتہ یوگوسلاویہ کے دوسرے مسلمانوں سے کٹ گیا۔

یوگوسلاویہ پر جرمنی کا حملہ | ۶ اپریل ۱۹۴۱ء کو ہٹلر کی نازی فوجوں نے یوگوسلاویہ پر قبضہ جمالیا اور اس کی تمام پرانی تقسیم مٹادی، یوگوسلاویہ کے بہت سے فوجی افسر اپنے سپاہیوں کے ساتھ پہاڑوں میں روپوش ہو گئے اور جرمنی افواج کے خلاف گوریلا جنگ لڑنے لگے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کا قتل عام | ان فوجی افسروں میں ایک سرب فوجی افسر میخلووچ تھا، اس کے ہمنواؤں نے جرمنی کے خلاف جنگ کے دوران بوسنیا و ہرزیگووینا اور مانٹینگرو کے دو لاکھ سے زیادہ بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا قتل عام کیا تاکہ ان کی تعداد کلیسائے یونان کے پیرو سربوں کے مقابلہ میں کم ہو جائے اور جنگ کے بعد ان علاقوں کو بسہولت سربیا میں شامل کیا جا سکے۔

متحدہ جمہوریہ یوگوسلاویہ کا قیام | جرمنی کے خلاف گوریلا جنگ کرنے والوں میں ایک نمایاں شخص جوزف بروز ٹیٹو تھا جس کی قیادت میں "سپاہ آزادی ملت" کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی، اس تنظیم کو یوگوسلاویہ کے عام باشندوں کی تائید حاصل تھی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں ٹیٹو نے سربیا کے بعض علاقے فتح کر لیے اور بالآخر اکتوبر ۱۹۴۴ء میں

بلغراد بھی اس کے قبضہ میں آگیا، غرض مارچ ۱۹۴۵ء میں یوگوسلاویہ کی مرکزی کا متحدہ حکومت قائم ہوئی، ہر صوبہ کی الگ الگ مقامی حکومتیں بنائی گئیں۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو باضابطہ متحدہ جمہوریہ یوگوسلاویہ کا قیام عمل میں آیا، اس میں چھ حکومتیں شامل تھیں۔ سربیا۔ کروشیا۔ سلوانیا۔ بوسنیا و ہرزیگووینا۔ مقدونیا۔ مونٹینگرو۔

موجودہ صورت حال ۱۹۹۱ء میں کمیونزم کے سب سے بڑے مرکز جمہوریہ روس کے بکھر جانے کے بعد ہی یہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے کہ متحدہ جمہوریہ یوگوسلاویہ کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے، چنانچہ اسی کے چند مہینوں بعد یہ جمہوریہ بھی ٹوٹ پھوٹ گئی اور اس کی تمام ریاستیں آزاد ہو گئیں اور دنیا کے بیشتر ملکوں نے ان کو تسلیم بھی کر لیا۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کے علاوہ یوگوسلاویہ کی بقیہ پانچ ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد کا تناسب بہت معمولی ہے اس لیے مسلم دشمن اقوام کو ان کے بارہ میں کوئی فکر نہیں ہوئی۔ مگر بوسنیا و ہرزیگووینا میں مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصد ہے اور مذہب اسلام سے وہاں کے باشندوں کا گہرا اور والہانہ تعلق ہے، اس لیے مسلم دشمن اقوام کو اس بات کا خطرہ ہوا کہ یہ مشرقی یورپ کی ایک مسلم ریاست نہ بن جائے، اس جمہوریہ کے پہلے انتخابات سے بھی اس کا اندازہ ہو گیا جس میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہوئی اور ایک معزز مسلم رہنما عالیجاہ عزت بیگوویچ اس کے صدر مقرر ہوئے اس کے سدباب کے لیے پہلے بوسنیا و ہرزیگووینا کے سربوں کو بغاوت پر آمادہ کیا گیا جو روس اور اس کے ہمنواؤں کا قدیم وطیرہ ہے، پھر ان سربوں کی حمایت کے نام پر سربیا نے بوسنیا و ہرزیگووینا پر حملہ اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا میں آباد کیتھولک عیسائی کروشن جو ابتداء میں مسلمانوں کے ساتھ تھے انھوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا، ان کو کروشیا کی تائید حاصل ہے، اور ان دونوں نے موجودہ متمدن دنیا اور علم و حکمت کے اس دور میں بوسنیا و ہرزیگووینا کے نہتے بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر وہ مظالم ڈھائے جنکی مثال جنگل کے راج اور وحشت کے دور میں بھی نہیں ملے گی۔ اس وقت تک انکے ظلم و ستم کے نتیجہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ مسلمان مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور ۲۵ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو خانماں برباد ہونا پڑا ہے، ہزاروں عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی گئی ہے، غرض ایسے وحشیانہ سلوک کیے گئے ہیں جن کو سن کر آدمی پانی پانی ہو جائے، بوسنیا و ہرزیگووینا کے قدیم مسلم تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی آثار و نشانات کو بھی خاص طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کے نتیجہ میں شہر کے شہر اور قصبات کے قصبات کھنڈر میں تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

اتنے نازک اور پُرآشوب حالات میں بھی بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی ہے جو ان کی مذہب اسلام سے سچی محبت کی دلیل ہے۔ بوسنیا و ہرزیگووینا کے تکلیف دہ واقعات کی خبریں روزآنہ آتی ہیں، مگر مغربی اقوام کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، یورپ کے بعض ملکوں میں وہاں کے لیے ہمدردی کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آرہا ہے، بالخصوص برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کا بیان اور ویٹکن کے پوپ کی دعائیں یہ سب دراصل ایک سیاسی کھیل ہیں، ان کا مقصد بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کی حمایت نہیں بلکہ بوسنیا میں آباد کروشن کا تحفظ یقینی بنانا ہے اور آئندہ بوسنیا و ہرزیگووینا کی مجوزہ تقسیم میں

کروشیا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچا تا ہے۔

سربیا کی حمایت میں سب سے پیش پیش روس ہے، روس کی پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر سربیا کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے خلاف اقوام متحدہ کی کسی تجویز کو جس میں سربیا پر فوجی اقدام کیا جائے، ویٹو کرنے کا حکم اپنے نمائندہ کو دیا ہے، حد یہ ہے کہ عالمی امن کے علم بردار نوبل پرائز یافتہ سابق روسی صدر گورباچیوف نے بھی سربیا کے ان جارحانہ حملوں کی حمایت کی ہے، گویا پورا یورپ اس وقت مسلمانوں کے خلاف ایک منصوبہ بند صلیبی جنگ میں مصروف ہے

بوسنیا و ہرزیگووینا میں تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے وہاں کے باشندے یونانی کلیسا کے متبع سرب اور کیتھولک چرچ کے پیرو کروش کے ظلم وستم کے شکار تھے اس وقت ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے ان دونوں سے علٰحدہ بوگول مذہب اختیار کر لیا تھا، آج پھر وہ ان کے مظالم کے شکار بنے ہوئے ہیں اور ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے پرستار ہیں، وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کی نگاہیں آج پھر کسی لالہ شاہین اور محمود پاشا کی منتظر ہیں مگر افسوس کہ یورپ کا مرد بیمار کب کا دم توڑ چکا، عرب ملکوں میں کوئی سیاسی اتحاد نہیں ہے اور پورا عالم اسلام سیاسی سطح پر بے وزن اور بے وقعت اور ان مظلوموں کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

والی اللہ المشتکیٰ

"خونِ جگر" اور اقبال

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب

"خونِ جگر" کی ترکیب پچھلے پچاس برسوں سے اردو ادب میں اقبالیات کے توسط سے آئی ہے اور اقبال نے اسے اپنے کلام میں اس کثرت سے استعمال کیا ہے کہ اس نے ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اقبال کے کلام میں "خونِ جگر" کی اصطلاح کئی معنوں میں آتی ہے۔ کہیں اس سے وہ خلوص اور جذبۂ عشق مراد لیتے ہیں تو کہیں اس سے خداداد صلاحیتیں، کہیں اس سے اپنے نصب العین سے والہانہ عشق مراد ہے تو کہیں مقصدِ حیات، کہیں اس سے عشقِ رسولؐ میں گرویدگی مراد ہے تو کہیں حسنِ عمل اور جہدِ پیہم۔ اقبال کے "خونِ جگر" کو اردو کے نقادانِ ادب نے صاحبِ فن کے اپنے فن سے انتہائی خلوص اور اس کے اپنے فن کے نصب العین سے والہانہ عشق کے معنوں ہی میں اصطلاحاً استعمال کیا ہے کیونکہ فن میں صداقتِ جذبات بہت اہم چیز مانی گئی ہے۔ ایسا اس لیے بھی کہ "خونِ جگر" کی اصطلاح سے اقبال کے زیادہ تر اشعار فنونِ لطیفہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اصطلاح اقبال کے کلام میں "بالِ جبریل" کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کے تیسرے بند کے درج ذیل شعر سے مشہور ہوئی ؎

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت

اس شعر کے بعد ہی یہ شعر ہے ؎

خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل

اسی موضوع پر اس نظم کا یہ آخری شعر ہے ؎

نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

اقبال صرف فن ہی کی نہیں بلکہ "معجزۂ فن" کی بھی باتیں کرتے ہیں جو معجزہ صرف صاحب فن کے "خونِ جگر" کی آمیزش سے نمود میں آتا ہے۔ "معجزہ" متکلمین کی ایک اصطلاح ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی فن میں بہت سے اصحاب فن ہوتے ہیں مگر سب کا فن "معجزہ" نہیں ہوتا۔ فن تب ہی "معجزہ" کی شکل اختیار کرتا ہے جب صاحب فن اپنی ساری فطری صلاحیتوں اور ذہنی طاقتوں، یعنی اپنی ساری فطری اور ذہنی متاع کو اپنے نصب العین کے حصول میں لٹا دے۔ عظیم فنکاری میں "خونِ جگر" کی اصطلاح سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں ہو۔ اس کلیہ کا اطلاق خود پر کرتے ہوئے "بالِ جبریل" کی نظم: "ذوق و شوق" کے تیسرے بند میں کہتے ہیں ؎

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش

ہم جسے "شخصیت" کہتے ہیں، خواہ وہ شخصیت صاحب فن کی ہو یا زندگی کے کسی شعبہ سے وابستہ کسی انسان کی، وہ صرف "خونِ جگر" کی آمیزش سے پروان چڑھتی ہے۔ یہی "خونِ جگر" اس کی شخصیت پر اثر انداز ہو کر اسے بقائے دوام بخشتا ہے۔ اس لیے جب ہم کسی صاحب فن کے فن یا زندگی کے کسی شعبے میں لگے کسی

عظیم انسان کے مطالعہ سے گذرتے ہیں تو قدم قدم پر اس کی شخصیت کی چھاپ ہمارے ذہن پر اثر انداز ہوتی چلی جاتی ہے۔ اقبال شخصیت کو مسلسل جد و جہد سے تعبیر کرتے ہوئے پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں کہتے ہیں :۔

"شخصیت یا مسلسل جد و جہد کی حالت انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ جو شے شخصیت کو مسلسل جد و جہد کی طرف مائل کرتی ہے وہ ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ لہذا وہ اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو کمزور کرے وہ بری۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے"

مگر جہاں تک فنکاری کا سوال ہے۔ ایک عظیم شخصیت کا ابھر کر سامنے آنا اقبال کے نزدیک صرف صاحب فن کی " الہامی صلاحیت" پر منحصر ہے۔ مرقع چغتائی کے دیباچہ میں اقبال اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں :۔

"کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اس کے شعراء اور آرٹسٹ کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے لیکن یہ ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو قابو حاصل ہو۔ یہ ایک عطیہ ہے۔ اس عطیہ سے فیضیاب ہونے والے کی شخصیت اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمہ یا تصویر سے لوگوں کے دل لبھا سکے، قوم کے لیے چنگیز خاں کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے"

اقبال کی ان تشریحات و توضیحات سے عظیم فنکار کی میں " خونِ جگر" کی اہمیت

ہمارے سامنے ایک الہامی عطیہ بن کر آتی ہے چونکہ صاحب فن کو اپنی عمل و ایجادی قوت اپنے فن میں منتقل کرنا ہے اس لیے فنکاری دراصل صاحب فن کے روحانی توازن کا اظہار بن جاتا ہے جس کی بنیاد صرف حقیقت کی جستجو اور اس کے اپنے نصب العین سے خلوص پر منحصر ہے۔ اس خلوص کی وجہ سے صرف صاحب فن کی شخصیت ہی ابھر کر سامنے نہیں آتی بلکہ اس کی وجہ سے ہمارے جذبات، ماحول اور خارجی حقیقتوں کے درمیان ایک ربط اور ہم آہنگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ صاحب فن کو "خون جگر" کی یہ آمیزش تو اس کے شعور کی غذا پر ملتی ہے اور اسی لیے ہر بڑا ذی فن باشعور ہوتا ہے۔ اس کے خلوص اور اپنے فن کے نصب العین سے عشق کی وجہ سے اس کی شخصیت کی خودی کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں دنیا کو اپنے شکنجہ میں کس لینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے جگر کے لہو کی آمیزش سے گرد و باد کے ماحول سے بالاتر ہو کر دنیا پر ایک مجموعی نظر ڈالتے ہوئے بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے۔ حالانکہ ہر صاحب فن اپنا ضمیر، اپنا ذہن اور اپنا ذوق لے کر پیدا ہوتا ہے مگر اپنے فن پر اپنی شخصیت کی چھاپ ہر صاحب فن نہیں چھوڑتا۔ "جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"

صاحب فن کی نظر زندگی کی قدروں کا داخلی طور پر تجزیہ کر کے اس پر فکر و نظر کی عمارت تعمیر کرتی ہے جو حسن خام کو کندن بنا دیتی ہے اور صاحب فن کو جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے خلوص ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ دلوں کے تاروں کو چھیڑتا ہے زندگی کے حسن میں بیداری پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے "خون جگر" سے نئی محفل سجاتا ہے جس میں دوسروں کو زندگی کی حقیقتیں

بے نقاب نظر آتی ہیں۔ اپنے فن میں "خونِ جگر" کی آمیزش سے وہ دل کے زخموں میں پھول کھلاتا، سینے کے داغوں میں چراغاں کرتا، الفت کے چمن کو "جنت ویراں نہیں بلکہ "جنت عرفاں" بناتا ہے۔ وہ صرف "فیضانِ محبت" ہی کو عام نہیں کرتا بلکہ "عرفانِ محبت" کو بھی عام کرتا ہے۔ اس کی زندگی فکر و نظر کی زندگی ہوتی ہے اور اسے حقیقت اور صداقت کی تلاش ہوتی ہے۔ حقیقت کے چہرے کی نقاب کشائی اس کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ وہ پرانے بتوں کو توڑ کر ساتھ ہی نئے بت تراشتا بھی جاتا ہے۔ اس لیے ایک عظیم صاحب فن اپنے خونِ جگر کے سہارے وسیع تر پیمانے پر قدروں کے ایک بڑے نظام کو دریافت کرکے اپنے خوابوں میں زندگی کی زیادہ سے زیادہ حقیقتوں کے درک کو سمو لیتا ہے۔

اقبال جب کہتے ہیں کہ: "نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر" تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ فن صرف حسن آفرینی کا نام نہیں بلکہ صاحب فن کو حسن کے آئینہ میں کچھ حقیقتیں بھی دکھلانی چاہیے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے دل میں خلوص ہو۔ اگر دل میں جوش نہیں، خلوص نہیں یا وہ صداقت نہیں جو بیک وقت ذوقِ لطیف کو آسودگی بخشے اور زندگی کو تابندگی عطا کرے تو ایسے نقش میں کوئی کشش نہیں ہوگی۔ اقبال کے تصورات میں یہ خلوص، یہ واقعیت اور حقیقت کے انکشاف کی یہ تلاش صرف صاحب فن کے رگ ساز میں صاحب ساز کے لہو رواں ہونے ہی پر منحصر ہے۔ بالفاظ دیگر یہ خلوص اور یہ سوز محض دکھاوے کی چیز نہ ہو بلکہ صاحب فن کی سیرت میں رچا ہوا ہو۔ فن میں "معجزۂ فن" کی نمود اسی وقت جلوہ نما ہوتی ہے جب فن والے کے دل میں وہ عشق پیدا ہو جائے

جس کا مقصد بنی نوعِ انسانی کی شیرازہ بندی پیدا کرنا ہے۔

اقبال کے تصورِ کائنات کی مشہور اصطلاح "عشق" ہے جس میں اقبال نے وجدان کے فطری عناصر کے ساتھ زندگی کے عملی عناصر کو بھی شامل کر دیا ہے اور یہی عشق، صرف فن ہی میں نہیں، بلکہ ہر انسان میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ یہ ہر ذرے کا تعلق اصل حقیقت سے قائم رکھتا ہے تاکہ اس کی مادی و معنوی تربیت ہو سکے۔ اقبال جب عظیم فن میں "خونِ جگر" کی بات کرتے ہیں تو وہ آرٹ کی بنیادی قدروں میں سے ایک قدر اس "عشق" کو بھی شامل کرتے ہیں۔ مسجدِ قرطبہ ہو یا بدھ کے مجسمے یا خمریاتِ خیام ان سب کی بنیادی قدریں تصورِ حسن اور سوزِ عشق سے وابستہ ہیں جن کے جلوؤں کا انعکاس و انضباط فنونِ لطیفہ کی بنیادی قدر ہے۔ صناعی اسی کا نام ہے۔ جب صناعت کامیاب ہوتی ہے تو تجربہ و اظہارِ تجربہ دونوں کامیاب ہوتے ہیں۔ صناعت صرف "جلوۂ طور" نہیں، "یدِ بیضا" بھی ہے۔ آرٹ کے پیدا ہونے کے لیے ایمان شرط ہے، خواہ ایمان ذرہ پر ہو یا ستاروں پر، پھول پر ہو یا حسین آنکھوں پر، شرابِ طہور پر ہو یا آبِ انگور پر، خودی پر ہو یا خدا پر۔

فن میں "خونِ جگر" کی آمیزش اگر صاحبِ فن کی پوری شخصیت کو ابھار کر رنگِ ثبات و دوام عطا کرتی ہے تو یہی دوامیت اس کی انفرادیت کی پہچان بھی بن جاتی ہے اس لیے کہ اعلیٰ اور غیر معمولی آرٹ زندگی کی انفرادی اور خالص شخصی امتیازات کا مرقع ہوتا ہے۔ مگر غیر معمولی فن، غیر معمولی تب بنتا ہے جب صاحبِ فن رنگینیوں کے باوجود عام اور مشترک سطح سے بلند ارفعیت تک پہنچ جائے۔ اس طرح انفرادیت کے غیر معمولی رنگوں کے امتزاج کے بغیر کوئی فن اپنے لیے ابدیت کا حقِ امتیاز پیدا نہیں

کر سکتا لیکن اس کے لیے "خونِ جگر" کی آمیزش سے بڑے غور و فکر اور گہرے درد و محبت کی ضرورت ہے جو انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں کے تناقض و تضاد اور بے آہنگی کو دور کرے۔ یہی وجہ ہے کہ فن میں انفرادیت کی پہچان صاحبِ فن کے اپنے فن میں خونِ جگر کی آمیزش سے پرکھی جاتی ہے۔ ان ہی اصولوں پر فنونِ لطیفہ میں، جہاں تک اردو شاعری میں انفرادیت کی پہچان کی بات ہے تو اس پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے فن میں صاحب فن کے "خونِ جگر" ہی کی آمیزش کے پس منظر میں یہ اظہار خیال کیا ہے کہ :-

"اردو میں انفرادیت کی مثال بڑی طویل منزلوں کے بعد ملتی ہے اور وہ منزلیں تو خاصے فاصلے پر ہیں جن میں ارفعیت کا مقام محمود نظر آتا ہے . . . . اگر دیکھا جائے . . . . تو اردو شاعری میں . . . غیر معمولی انفرادیت کے نشانات بہت مسافتیں طے کرنے کے بعد بھی کم دستیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً میر کے بعد غالب اور غالب کے بعد اقبال اور بس۔ حالانکہ اس تمام زمانے میں شعرا کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہے۔"

اردو شاعری میں یہ انفرادیت صرف تین ہی میں اس لیے ملتی ہے کہ میر کے یہاں یہی "خونِ جگر" درد و غم کا نام پاتا ہے، غالب کے یہاں اس کے لیے "دل گداختہ" اور اس طرح کی اصطلاحیں ملتی ہیں اور اقبال نے ان سب کو سمیٹ کر "خونِ جگر" کا نام دیا جو ایک صاحب فن کی پوری شخصیت پر محیط ہو جاتا ہے۔

اقبال صرف صاحب فن ہی میں "خونِ جگر" کی آمیزش کی تلقین نہیں کرتے بلکہ وہ عبادت میں بھی اس کی آمیزش فلاح کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں یعنی عشق

رسولؐ میں وہی گرویدگی، وہی جذبۂ عشق اور وفاداری کا وہی پاس اور وہی خلوص جو دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ چنانچہ دعا کے معاملے میں بھی وہ دعا کرنے والوں کو اپنی دعا میں اپنے جگر کا لہو یعنی عشقِ رسولؐ کا رنگ منعکس ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں جسے قرآن مجید میں خشوع و خضوع کا نام دیا گیا ہے۔ نماز، بروئے شریعت، سب سے بڑی عبادت ہے اور عبادت کا مغز دعا ہے۔ چنانچہ مسجد قرطبہ میں بھی اگر اقبال دعا گو ہیں تو اپنی دعا میں "خونِ جگر" کی آمیزش ہی کی باتیں کرتے ہیں، کہتے ہیں ؎

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو　　میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
(بالِ جبریل، "دعا")

آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی تعلق وجدان سے ہے اور دونوں کی ظاہری اور باطنی جہتیں ہیں۔ آرٹ میں ہیئت کا وہی مقام ہے جو مذہب میں شریعت کی جگہ ہے۔ اول الذکر میں فنی تجربے کی ذہنی کیفیت ہے تو ثانی الذکر میں طریقت یا باطنی تجربے کی۔

اقبال "خونِ جگر" سے انسان کی خداداد صلاحیتیں بھی مراد لیتے ہیں۔ "بالِ جبریل" کی غزل ۱۶ اکے درج ذیل شعر میں کہتے ہیں ؎

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا　　نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

یہاں وہ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ خدا نے انسان کو جو فطری صلاحیتیں عطا کی ہیں اسے مقصدِ حیات کو حاصل کرنے کے لیے صرف کرنا چاہیے نہ کہ دنیا کی فانی و لایعنی دلچسپیوں میں۔

اقبال "خونِ جگر" سے مسلسل جد و جہد بھی مراد لیتے ہیں۔ جیسے "ضربِ کلیم" کی نظم

"ناظرین سے" کے اس آخری شعر میں ؎

خونِ دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل! نہ جل ترنگ"

اقبال کے یہاں اس "خونِ جگر" کی اہمیت تسخیرِ کائنات اور کوششِ پیہم کے معنوں میں بھی آتی ہے۔ "بالِ جبریل" کی نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے چوتھے بند میں اس پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں — آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں — جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل، کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

اپنے دورۂ ہسپانیہ (موجودہ اسپین) میں ہسپانیہ کے شہر قرطبہ (کورڈووا) میں واقع مسجد قرطبہ کے نقش و نگار میں اقبال کو "قافلۂ سخت جاں" کا خونِ جگر نظر آیا۔ اسی ہسپانیہ میں جہاں مسلمانوں نے سات سو سال سے زائد حکومت کی مگر آج وہاں مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا تو وہ اس المیہ پر اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس بندھاتے ہیں ؎

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی — باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں (بالِ جبریل، ہسپانیہ)

اخبار علمیہ

بوسنیا ہرزی گووینا کے مسلمانوں کے قتل عام اور ان کے شہروں اور بستیوں کی بربادی کے لرزہ خیز واقعات سے اب کون ناواقف ہے، بیسویں صدی کی "مہذب دنیا" میں انسانوں کی اس شیطنت و بربریت پہ جنگل کے وحوش و بہائم بھی شرما اٹھے ہیں، ترکی کے ادارہ IRCICA کے ترجمان رسالہ سے جو ہمیں تاخیر سے موصول ہوا، اندازہ ہوتا ہے کہ سرب عیسائیوں اور مسیحی صلیبوں کا مقصد صرف خون مسلم کی ارزانی کا تماشہ دیکھنا ہی نہیں ہے بلکہ نہایت منظم طریقہ سے یورپ میں واقع مسلم آبادی کے مذہب، تہذیب، تاریخ اور معیشت کو تاخت و تاراج کر دینا ہے، اسی لیے ان کے حملوں کا خاص نشانہ مسجدیں، کتب خانے اور علمی و ثقافتی مراکز ہیں، جن مساجد کو شہید کیا گیا ہے ان میں بعض نہایت تاریخی اہمیت کی تھیں مثلاً فوکا کی سلطان بایزید کی مسجد جو سنہ ۱۵۰۰ء میں تعمیر ہوئی تھی، سنہ ۱۵۵۵ء کی الاکا مسجد جسے قدیم عثمانی طرز تعمیر کا شاہکار خیال کیا جاتا تھا، بوسنیا کی سب سے قدیم مسجد اسی کولینا میں سنہ ۱۴۴۸ء میں تعمیر ہوئی تھی، سنہ ۱۹۴۱ء میں اسے نقصان پہنچایا گیا تھا مگر اب اسے مکمل منہدم کر دیا گیا، موستار شہر میں سولہویں اور سترہویں صدی میں تعمیر شدہ کئی خوبصورت مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا، عثمان پاشا بیگووک کی مسجد سنہ ۱۷۲۶ء میں تعمیر ہوئی تھی اور اپنے در و دیوار پر منقش خطاطی کے حسین نمونوں

کے لیے مشہور تھی اسے اور سراجیوو کی شیخ مغربی مسجد کو جو اسلامی فن تعمیر کا نادر نمونہ تھی پوری طرح زمیں دوز کر دیا گیا، مساجد کے ساتھ عام طور پر مکاتب اور خانقاہیں بھی ملحق تھیں انہیں بھی نیست و نابود کر دیا گیا ان میں بلاگاج کی وہ خانقاہ بھی ہے جسے ترکی کے آرائشی طرز تعمیر کا بے مثال نمونہ ہونے کی بنا پر یورپ کے اور ملکوں میں بھی شہرت حاصل تھی، ایک مشہور صوفی درس گاہ حنیکا کا وجود بھی باقی نہ رہا، کتب خانوں میں غازی حسرو بے کا کتب خانہ جو سراجیوو کی زار مسجد سے ملحق اور ۱۵۶۵ء میں تعمیر ہوا تھا اور پورے بلقانی خطہ کا سب سے شاندار خزنیہ کتب تھا اور اس کا ذکر ان کالموں میں پہلے آچکا ہے اسے بھی خاکستر میں بدل دیا گیا ، سراجیوو کی اسلامک فیکلٹی آف تھیالوجی' اسلامک لا اسکول جسے ٹاؤن میوزیم بھی کہا جاتا تھا اور حاجی سنان کا تکیہ یہ سب اب قصۂ پارنیہ بن گئے' لیکن اس المناک داستان کا سب سے روح فرسا باب سراجیوو کے علوم مشرقیہ کے ادارہ کی تباہی ہے جسے علم جدید کے مدعیوں نے صرف ایک دن میں جلا کر راکھ کر دیا، عربی' فارسی، ترکی اور بوسنیائی زبان کے اس اہم مرکز کو ۱۹۵۰ء میں جدید طرز پر قائم کیا گیا تھا، اس کی ثروت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں صرف سائنس، فلسفہ اور ادبیات کے موضوع پر گیارہویں صدی ہجری تک کے ۵۲۶۳ مخطوطات کا خزانہ تھا، ان کے علاوہ سولہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک کے تقریباً سات ہزار دستاویز اور وثیقے تھے جن میں سلطانی احکام و فرامین' درباری اسناد' انتظامی روداد اور مالیاتی کاغذات شامل تھے، ان کے علاوہ بوسنیا کے صوبوں اور جاگیرداروں کے متعلق دو لاکھ دستاویزیں بھی تھیں، ان سب کے علاوہ

اس انسٹی ٹیوٹ کا مکمل منتخب ذخیرہ کتب بھی جل کر راکھ ہو گیا، کیا اس وسیع پیمانے پر معصوم انسانوں کی خوں ریزی و سفاکی کے ساتھ علم و حکمت کے موتی و جواہر کو مٹی میں ملانے والوں کے ان کارناموں کو بنی نوع انسان کی تاریخ کبھی فراموش کر سکے گی۔

بوسنیا کی خونچکاں حکایت کا یہ ورق لکھا جا چکا تھا کہ مذکورہ خبرنامہ کا تازہ شمارہ خاص نمبر کی شکل میں موصول ہوا، اس میں بوسنیا کی مذہبی، قومی اور تہذیبی تاریخ کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، گویا یہ بوسنیا نمبر ہے، اس میں بھی ۱۰۸ مسجدوں، مدرسوں اور قدیم تاریخی مراکز کی بربادی کا نام بنام ذکر ہے، خبرنامہ کے مطابق تباہی صرف اسی تعداد تک محدود نہیں بلکہ ظالموں نے ہر بستی اور ہر گاؤں میں اپنی بربریت کا نشانہ سب سے پہلے مساجد و مدارس ہی کو بنایا ہے، یہ خصوصی شمارہ تین زبانوں یعنی عربی فرانسیسی اور انگریزی میں ہے اور اس کے مہمان مدیر ایک بوسنوی النسل ماہر فنِ تعمیر ڈاکٹر عامر پاشتیش ہیں۔

ساری دنیا اور خود یورپ میں اب بوسنیا کی تاریخ سے واقفیت کا شوق روز افزوں ہے، چنانچہ جرمن زبان میں ایک تازہ کتاب "نامعلوم بوسنیا، یورپ اور عالم اسلام کے درمیان ایک پل" کے نام سے شایع ہوئی ہے، یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں اس کی ابتدائی تاریخ، قرون وسطیٰ میں جنوبی یورپ کی عام حالت، وہاں اسلام کی آمد، عثمانی خلافت سے قبل و بعد کی تمدنی و تہذیبی اور تعمیری حیثیت، دینی، علمی اور ادبی حالت وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے اور آخری باب میں معاصر یورپ سے اس کے ربط و رشتہ پر بھی پر از معلومات گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مصنف بھی بوسنیا کے ایک اہل قلم اسمٰعیل بالک ہیں۔

نالۂ دل کے ساتھ بوئے گل کا رشتہ محض شاعرانہ خیال نہیں ہے، اس کی ایک مثال استنبول ترکی سے شایع ہونے والی نئی کتاب "اوراق گلابان" ہے، ترکی زبان کی اس کتاب کے مصنف بشیر ایاز اوغلو ہیں، اس میں ترکی ادب و معاشرت پر پھولوں کے اثرات کا دلچسپ جائزہ لیا گیا ہے، ترکی میں بھی گلاب کی حیثیت گل سرسبد کی ہے، لیکن وہاں کے ادب، شاعری اور عوامی داستانوں کو گلاب کے علاوہ دوسرے اور پھولوں نے بھی رنگینی و رعنائی عطا کی ہے، آرائیشی اشیا، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ میں اور باغوں اور گلزاروں میں کن پھولوں کا حسن زیادہ دلکش و دلفریب ثابت ہوا ہے؟ اور مختلف زمانوں میں کن پھولوں کی زیادہ قدر افزائی ہوئی اور کون سے پھول نگاہوں سے اترے؟ ان دلچسپ سوالوں کے ساتھ یہ سوال بھی زیر بحث آیا ہے کہ عہد اسلامی سے پہلے اور پھر اسلام کے ابر کرم کے برسنے کے بعد کن پھولوں نے عوام کو اپنی خوبی و زیبائی سے سرشار کیا؟ مصنف کا منہج تحقیقی ہے لیکن کتاب اپنے دلکش ادبی اسلوب سے نمایاں ہے۔

ترکی اور ہندوستان کے ترکی صغیر حیدرآباد دکن میں یکسانیت کی متعدد مثالیں ہیں، قسطنطنیہ اور حیدرآباد کی افسانوی شہرت پر عام اتفاق ہے، سال ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد کو بسے ہوئے چار سو برس پورے ہوئے تو اس شہر اور اس کی تہذیب کے شیدائیوں نے مختلف شکلوں میں جشن تاسیس منایا، اسی موقع پر ایک آسٹریلیائی اہل قلم ایان آسٹن نے "داستانوں کا شہر، حکایت حیدرآباد" کے نام سے ایک دلچسپ کتاب لکھی جو بقول مصنف تاریخ (ہسٹری) سے زیادہ کہانی (اسٹوری) ہے، تاریخی حیثیت سے کمتر ہونے کے باوجود حیدرآباد کی تہذیب اسکے فرمانرواؤں کی رواداری و فیاضی اور عام لوگوں کی امن پسندی اور معاشرہ کی زندہ دلی کی یہ داستان واقعی دلکش اور پر اثر ہے۔

ع۔ ص۔

تلخیص و تبصرہ

آذربائیجان

سوویت یونین کی ریاست آذربائیجان کی راجدھانی باکو ہے، یہ بحر قزوین (Caspienne) کے قریب ہے اس کے مغرب میں جورجیا اور شمال مغرب میں داغستان ہے یہ سب ریاستیں سوویت یونین کا جزء تھیں جو اب آزاد ہو چکی ہیں، آذربائیجان کی سرحدیں ایران سے بھی ملتی ہیں، اس کا مجموعی رقبہ چھیاسی ہزار چھ سو تیس کیلو میٹر ہے جس میں اس کی ماتحت جمہوریہ ناختشفان (Nohcivan) اور قرہ باغ (Kar-abagh) کا علاقہ بھی شامل ہے۔

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق آذربائیجان کی آبادی تقریباً اسّی لاکھ ہے جس میں ۹۴ فیصدی کرد ہیں جو آذربائیجان کے پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں۔ کچھ تاتاری النسل کے لوگ بھی ہیں جو نہر کورا (koura) کے کنارے شہر باکو میں آباد ہیں، علاوہ ازیں یہاں قریب کے ملکوں سے آکر بھی لوگ آباد ہو گئے ہیں جنکی زبان بھی ترکی ہے۔ روسی زبان کو آذربائیجان میں ثانوی حیثیت حاصل ہے اور اس کے دور دراز علاقوں ہی میں بولی جاتی ہے۔ آرمینیائی اور جورجیائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں ۱۹۲۰ء میں آذربائیجان جمہوریہ بنا اور ۱۹۳۶ء میں اس پر سوویت یونین کا مکمل تسلط ہو گیا، آذربائیجان کے باشندوں میں ۸۰ فیصدی مسلمان ہیں جن میں شیعہ بھی قابل ذکر تعداد میں ہیں ان کے علاوہ روسی ارمنی اور جورجیائی النسل

عیسائیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے اور کچھ یہودی بھی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی امور کی دیکھ بھال کے لیے باکو میں ایک کمیٹی قائم ہے، اس طرح کی کمیٹیاں مسلم اکثریت کے دوسرے علاقوں ازبکستان، وآذرفا، باشکیریا، ویونیاکسک اور داغستان میں بھی ہیں جہاں کے مفتی ان کمیٹیوں کے سربراہ ہوتے ہیں۔

آذربائیجان میں گیہوں اور روئی بکثرت پیدا ہوتی ہے، ان کے علاوہ چاول بھی ہوتا ہے، ماہی گیری بھی ایک اہم ذریعۂ آمدنی ہے، بحر قزوین (Caspian) کے ساحلی علاقوں میں چائے کی عمدہ کاشت بھی ہوتی ہے، انگور اور مختلف قسم کے پھلوں اور سبزیوں کے لیے بھی یہ خطہ مشہور ہے، ان کا کاروبار بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ پٹرولیم اور قدرتی گیس بھی کافی مقدار میں نکلتے ہیں، لوہے اور تانبے کی معدنیات بھی دستیاب ہیں۔ جن سے مختلف قسم کی مشینیں اور کل پرزے تیار کیے جاتے ہیں۔ آذربائیجان کی اقتصادی حالت اطمینان بخش ہے ۲،۴۴۶،۰۰۰ افراد برسر روزگار ہیں، زراعت، صنعت و حرفت سے وابستہ ہونے کے علاوہ ۵۴ فیصدی افراد ملازمت پیشہ ہیں، لوگوں کی اوسط ماہانہ آمدنی ۱۹۶،۸ روبل ہے، جدید سائنسی ایجادات ٹی۔ وی سٹ، ریفریجیٹر وغیرہ کے یہاں رواج و استعمال سے ملک کے لوگوں کی خوش حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں کے علمی اور تعلیمی اداروں میں آذربائیجان اکیڈمی آف سائنسز اور رسول زادہ اسٹیٹ یونیورسٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکیڈمی میں مختلف علوم و فنون سے متعلق تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں اور رسول زادہ یونیورسٹی میں جدید سائنسز کے تمام شعبے ہیں، دوسری یونیورسٹیوں میں فیہری مانوف یونیورسٹی آف

میڈیسن، نصرالدین طوسی یونیورسٹی، عزیزبیوف آئل انڈسٹریل یونیورسٹی، چنگیز ہلدرم ٹیکنیکل یونیورسٹی، مرزا ستاعلی (SAT ALI) آخوندوف انسٹی ٹیوٹ آف رشین لینگوئج، آذربائیجان اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف فنانس، فارن لینگویجز، سول انجینیئرنگ پیٹرولیم، فائن آرٹس یونیورسٹیاں وغیرہ بھی لائق ذکر ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں آذربائیجان اسلام کے زیر نگیں ہوگیا تھا، انھوں نے اس کا علم حذیفہ بن یمان کے سپرد کر دیا تھا۔ انھی کی کوششوں سے یہاں اسلام کی نشر واشاعت کا آغاز ہوا اور بتدریج آذربائیجان کا پورا علاقہ حلقہ بگوش اسلام ہوگیا، یہاں جب عربوں کی آمد ورفت شروع ہوئی تو مصر اور شام کے قبائل بھی آباد ہونے لگے تھے اور مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ بحر خزر کی سرحد کے قریب شہر دربند اور شروان کے شہروں تک پہنچ گیا اور وہ داغستان کے بعض علاقے فتح کرتے ہوئے خزر کی راجدھانی بلنجر تک پہنچ گئے، حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت حبیبؓ ابن مسلمہؓ نے شہر تفلیس فتح کیا جو اسلامی ریاست کا دارالحکومت قرار پایا۔

مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں کے گورنروں کی دعوت اسلام کے نتیجہ میں شہر تبریز اور کو باکو اسلام کی ضیاء پاشیوں سے منور ہوئے، ہشام بن عبدالملک کے عہد میں اس کے بھائی مسلمہ نے دربند میں مسلم حکمرانی کو مزید قوت واستحکام عطا کیا اور ۱۰۵ھ میں داغستان بھی زیر نگیں کر لیا، اسی زمانے میں مسلمہ نے اہل خیزران سے مصالحت کے بعد ان کا قلعہ ڈھا دیا اور اس کو اپنی جاگیر بنا لیا۔ اس کو آج کل خورخیزران کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کے بعد کوہستانی علاقوں کے بادشاہ بھی باجگذار ہو گئے اور شہر باب بھی فتح ہوگیا، اس شہر میں تقریباً ایک:

خزری پناہ گزین تھے مسیلہ نے ان کا محاصرہ کرکے شہر باب الابواب میں چوبیس ہزار شامیوں کو وظیفہ دے کر آباد کیا اس کے بعد مروان بن محمد وہاں کے سرحدی خطہ کا والی مقرر ہوا اس نے بھی جہاد کا سلسلہ جاری رکھا، چنانچہ والی خیزان نے اسلام قبول کرلیا تو مروان نے اسے اس کے منصب پر بحال رکھا اور غزوات کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا اور بحر خزر پر دفاعی چوکیاں بنا دی گئیں تاکہ ان کے ذریعہ مملکت اسلامیہ کا تحفظ کیا جاسکے اور وہاں سے اسلام کی نشر و اشاعت کا فریضہ بھی انجام دیا جاسکے۔

غرض بنی امیہ کے آخری عہد میں تفقازیا میں مسلم حکمرانی کا دور دورہ ہوگیا تھا اس کے نتیجے میں یہاں عربی زبان و ثقافت کے فروغ کے علاوہ بڑی تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔

بنو عباس کے عہد حکومت میں بھی اسلام کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رہا، خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں یزید بن اسید السلمی آذربائیجان کے سرحدی علاقوں کے گورنر مقرر ہوئے، جنھوں نے آذربائیجان کے شمالی علاقوں کو اسلام کی نشر و اشاعت کا مرکز بنایا اور جب بغا الکبیر عباسی افواج کا کمانڈر ہوا تو اس نے بھی مروجہ طریقہ پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیا۔

پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں آذربائیجان کے کچھ ممتاز خاندان نمایاں ہوئے ۵۳۱ھ میں اتابک ایلدگوز یہاں کا حاکم ہوا ۶۲۲ھ میں جلال الدین خوارزم شاہ نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور ۶۵۶ھ میں اس پر مغلوں کا قبضہ ہوا، انھوں نے اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنالیا ۹۰۱ھ میں یہاں صوفیوں کا زور رہا بالآخر عثمانیوں

نے اپنی حکومت قائم کی، انیسویں صدی کے آغاز تک آذربائیجان میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی لیکن اس کے بعد ان کا زوال شروع ہوگیا اس کی وجہ سے روسیوں کا اس پر حملہ شروع ہوا، اس زمانہ میں آذربائیجان چھوٹی خود مختار ریاستوں میں منقسم ہوچکا تھا جو باہم برسر پیکار تھیں گو وہاں کے مقامی سربراہوں نے زار کی فوجوں کا مقابلہ ضرور کیا لیکن وہ بالکل بے دم ہوچکے تھے اس لیے ان کی کوششیں کارگر نہیں ہوسکیں، غرض ۱۲۱۶ھ میں روس نے جنوبی توقاز اور جورجیا کو ساتھ ملاکر آذربائیجان کی ایک ریاست گنجہ پر دھاوا بول دیا اس ریاست کے سردار جواد خاں نے دلیری کے ساتھ مدافعت کی لیکن اپنے دو ہزار بہادروں کے ساتھ مارے گئے اور میدان روسیوں کے ہاتھ رہا انھوں نے ریاست کا نام بدل کر زار اول الیگزنڈر کی بیوی کے نام پر یزا دتیل رکھ دیا، اس کے بعد آذربائیجان کے دوسرے علاقوں پر بھی یکے بعد دیگرے ان کا قبضہ ہوتا چلا گیا جس کی تفصیل یوں ہے۔

ریاست تنکی ۱۲۲۳ھ میں، ریاست شماص ۱۲۳۶ھ میں اور ریاست قارابغ ۱۲۲۸ھ میں ان کے مقبوضات میں شامل ہوئی، ان معرکوں میں آذربائیجان نے بڑی پامردی کا ثبوت دیا اور انھوں نے روسی جنرل سیتانوف کو قتل کرڈالا اس کے بعد روسی افواج کا ظلم و تشدد ان پر اور بھی سوا ہوگیا اور انھوں نے ان کی املاک و جائداد پر بھی زبردستی قبضہ کرلیا، سوویت علوم اکیڈمی کے معہد تاریخ و فلسفہ کے استاد ایک روسی مورخ نے اپنے آباء و اجداد کے ان مظالم کا اعتراف کیا ہے۔

آذربائیجان اور تمام مسلم صوبوں میں زار حکومت کے خلاف متعدد بغاوتیں ہوئیں ۱۹۰۵ء میں آذربائیجان میں جو بغاوت ہوئی اس نے روس کی مسلم حکومتوں کے ساتھ ہی خود روس کو بھی اپنی زد میں لے لیا تھا، اس زمانہ میں کئی سرگرم جماعتیں وجود میں آئیں جن میں اہم جماعت کا نام جماعۃ المسلمین لعموم روسیا تھا جس کا مقصد روسی مسلمانوں کے دینی و سیاسی حقوق کی بازیافت تھا اس کا آذری سیاسی رہنما علی مردان طوبچی پاشا تھا ۱۹۰۷ء میں زار روس نیقولا ثانی نے جب روسی پارلیمنٹ کو تحلیل کرکے آذربائیجان کے نئے انتخابی قوانین مرتب کیے تو پارلیمنٹ میں روس کے مسلمانوں کی نمائندگی گھٹ کر دس سے چھ ہوگئی، ۱۹۱۰ء میں روسی وزیراعظم سولیبین نے سرکلر جاری کیا جس میں زار کی سلطنت کی جس سیاسی پالیسی کی وضاحت کی گئی تھی وہی پالیسی بعد میں بالشویکی حکومت کی بھی رہی بلکہ یہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تمام مسیحی حکومتوں کی بھی پالیسی ہے، سولیبین کے سرکلر کا متن یہ تھا۔

"اسلام اور مسیحیت کا اختلاف محض مذہبی نہیں ہے بلکہ یہ ایک سیاسی تہذیبی، لڑائی اور اقتدار کی جنگ ہے، ادھر چند برسوں میں اسلامی دعوت کو جو کامیابی ہوئی ہے اس سے ہم کو چوکنا رہنا چاہیے، یہ کامیابی وطن عزیز روس کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے باوجودیکہ روس کے مسلمان مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان کے طور طریقے اور زبان کے لہجے وغیرہ کسی قدر مختلف ہیں تاہم یہ سب ترکی سے تعلق رکھتے ہیں اور سب ترکی زبان بولتے ہیں"۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد روس کے زیر تسلط علاقوں میں گرچہ عام سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت ہوگئی تھی مگر روسی حکمراں مسلم زعماء کو خلافت عثمانیہ

کا جاسوس اور آلۂ کار خیال کرتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں روسی وزیر داخلہ نے یہ حکم دیا کہ مسلم علاقوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے اور اگر مسلمان کوئی سیاسی تنظیم قائم کریں تو اسے خلاف قانون قرار دے کر اس کے سربراہوں کو گرفتار کر لیا جائے روس میں مسلم ریاستوں کی نئی جمہوری ریاستوں کے بارے میں یہی دوہری پالیسی آج تک جاری ہے۔

فروری ۱۹۱۷ء میں روس میں جو ناکام بغاوت ہوئی اس کے نتیجہ میں اسی سال اکتوبر میں اشترا کی انقلاب رونما ہوا اور بالشویک حکومت قائم ہوئی اس سے پہلے یہاں کے مسلمانوں کی ایک دس روزہ کانفرنس یکم تا ۱۱ مئی کو منعقد ہوئی۔ جس میں محمد رسول زادہ نے یہ تجویز پیش کی کہ روسی فیڈرل میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو خودمختاری و آزادی دی جائے، اس تجویز پہ کانفرنس کے اکثر شرکاء متفق تھے۔

بالشویکی حکومت کے قیام کے بعد لینن نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ اگر انہوں نے ڈینکن کے خلاف اس کا ساتھ دیا تو ان کی ریاستوں کی آزادی برقرار رکھی جائیگی اور انہیں بھی مکمل مذہبی آزادی دی جائے گی، چنانچہ ایک ماہ بعد، دسمبر ۱۹۱۷ء کو برسراقتدار بالشویک پارٹی نے مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے دوسروں کے علاوہ خود لینن و اسٹالن کے دستخط سے یہ اعلان کیا کہ:۔

"اب لوٹ گھسوٹ اور سرمایہ دارانہ جبر و تشدد کے خاتمہ کا وقت قریب آگیا ہے، سامراجیوں کی حکومت لب گور پہونچ چکی ہے، ہم روس اور مشرق کے مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں، یہ محنت و مشقت سے کھیتی اور مزدوری کرتے

ہیں لیکن ان کے حقوق سلب کر لیے گئے ہیں، ان کی عبادت گاہوں اور مقبروں کی
بے حرمتی کی جاتی ہے، ان کے اعتقادات اور مذہبی امور میں مداخلت کی جاتی ہے،
ظالم زار حکمران ان کی عزت و آبرو پامال کرتے اور ان کی جان و مال سے کھیلتے
رہے ہیں لیکن اب ان کو اپنے عقائد اور مذہبی امور اور تہذیب و ثقافت کے
بارے میں مکمل آزادی حاصل ہو گی اور ان پر کوئی تشدد نہیں کیا جائے گا،
نئی حکومت روسیوں ہی کی طرح مسلمانوں کے حقوق کی بھی محافظ ہو گی اور اس کی
ساری مشینریاں اور عوامی نمائندے ہر طرح ان کی مدد کے لیے تیار رہیں گے،
اس لیے وہ اس حکومت کے وفادار اور مددگار بن جائیں، یورپ کے ظلم و
ستم برداشت کرنے والو بیدار ہو جاؤ اور اپنی گردنوں سے غلامی کا طوق
نکال دو اور متحد ہو کر ان جابروں کا مقابلہ کرو۔"

غرض روس کے حکمرانوں نے خود اپنی زبان سے روس میں مسلمانوں کے
ستائے جانے کا اعتراف کر کے انہیں یہ خوش خبری دی تھی کہ اب ان کے
مصائب کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا، لیکن ان کے سارے وعدے اور یقین
دہانیاں باد ہوا ہو گئیں، بیچارے مسلمانوں نے تو نئے روسی نظام کے ساتھ
پورا تعاون کیا مگر بالشویک حکمرانوں نے اپنا تسلط جمانے کے بعد ان کو آزادی اور
خود مختاری دینا پسند نہیں کیا۔

سب سے پہلے مئی ۱۹۱۸ء میں قوقازنے خود مختاری کا اعلان کیا اس کے
معاً بعد جورجیا نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا لیکن لینن نے دونوں جگہ بغاوت
کرا دی اور سیستان شادمیان کو بھی آلۂ کار بنا کر آزادی کو کچلنے کی مہم شروع کر دی

اس تصادم میں صرف شہر باکو میں مارچ ۱۹۱۸ء میں اٹھارہ ہزار مسلمان شہید ہوئے، ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء میں ترکی افواج کے ذریعہ اس فتنے کا استیصال ہوا مگر جنگ میں ترکی افواج کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ادھر ایران کی سرحد سے برطانوی فوجوں نے ترکی افواج پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۱۸ء میں ترکی فوج وہاں سے ہٹ آئی، ۱۰ اگست ۱۹۱۹ء کو برطانوی افواج کو بھی آذربائیجان کے مقامی باشندوں کی پامردی اور استقلال کے سامنے پیچھے ہٹنا پڑا، ان کے ہٹنے کے بعد محض دو سال یہ جمہوریہ آزاد رہ سکی کیونکہ ، اپریل ۱۹۲۰ء کو لینن کی فوجوں نے آذربائیجان پر حملہ کر کے اسے اپنے زیر نگیں کر لیا۔ یہ سب کچھ اس وعدے اور یقین دہانی کے بعد کیا گیا جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، چند برس پہلے افغانستان کے ساتھ بھی روس نے یہی طرز عمل اختیار کیا تھا، غرض ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو سوویت یونین کی اشتراکی جمہوریہ آذربائیجان کی تشکیل ہوئی جو مارچ ۱۹۲۲ء میں آرمینیا، جورجیا میں اس لیے ضم ہو گئی کہ ان کے مجموعہ سے جمہوریہ قفقاس کی تشکیل عمل میں آئے، مگر اس جمہوریہ کو توڑ کر سوویت یونین میں شامل کر لیا گیا۔ روس کے ان جارحانہ اقدامات کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد سے آذربائیجان میں بغاوت رونما ہوئی مگر روس کی مسلح فوجوں نے اسے فرو کر دیا۔

ان مظالم کو عرب اور مسلمان ممالک بالکل خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے، حالانکہ ان کی شدت و سنگینی کا اعتراف روس اور امریکہ والوں کو بھی رہا، مگر عربوں کی حکومتیں اپنی کمزوری اور انتشار کی وجہ سے روس کے مقابلہ کی

جرأت وہمت نہیں ہوئی۔

اگست ۱۹۹۱ء میں گوربا چوف کے دور میں جو زبردست تاریخی انقلاب رونما ہوا اس نے روس سے اشتراکیت کو نیست ونابود کر دیا، اس عظیم انقلاب کے بعد غیر مسلم ریاستیں لیتھوانیا، اسٹونیا اور لاٹیفیانے جب اپنی آزادی کا اعلان کیا تو امریکہ کی سربراہی میں دنیا کے تمام ملکوں نے اسے تسلیم کر لیا اور اقوام متحدہ نے اس کا خیر مقدم کیا مگر جب ان کی تبعیت میں اسلامی جمہوری ریاستوں آذربائیجان، ازبکستان اور ترغیزیا نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو دنیا کی تمام بڑی حکومتیں چپ سادھے رہیں، یہاں تک کہ خود مسلمان حکومتوں کو بھی انہیں تسلیم کرنے میں معلوم نہیں کیوں پس وپیش ہوا، ممکن ہے آیندہ اس راز سے پردہ اٹھے۔ (ماخوذ از الازہر)

سلسلۂ تاریخ اسلام

اس میں عہد رسالت وخلافت راشدہ یعنی آغاز اسلام سے بنو امیہ اور بنو عباس اور اندلس، صقلیہ اور ترکی کی خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے۔

حصہ اول زیر طبع، دوم (بنو امیہ) ۴۰ روپیے، سوم چہارم (بنو عباس) ۵۰، ۵۰ روپیے، تاریخ اندلس زیر طبع، دولت عثمانیہ اول ودوم ۵۵، ۵۰ روپیے، تاریخ صقلیہ اول ودوم ۶۰، ۵۰ روپیے۔

"منیجر"

معارف کی ڈاک

دفتر اردو دائرہ معارف اسلامیہ،

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مورخہ ۸ جون ۱۹۹۳ء

فاضل مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ معارف (اپریل) کا شمارہ کل ملا۔ شذرات حسب معمول برمحل اور حسب حال ہیں، پچھلے ہفتے ہمیں ترکیہ کے محکمہ اوقاف کی طرف سے ترکی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (اسلام انسکلوپیڈیسی) کی ساتویں جلد موصول ہوئی۔ یہ جلد حرف "ج" سے شروع ہونے والے اسماء داعلام اور مشہور کتابوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ حسب سابق اس جلد کی زبان ترکی (رومن رسم الخط) ہے، صرف عنوانات عربی رسم الخط میں ہیں جن سے مشمولات و مندرجات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے ان میں سے چیدہ چیدہ مقالات کا تعارف حسب ذیل ہے:۔

جلد کی ابتدا میں امام جعفر صادقؒ اور فرقۂ جعفریہ پر مقالات ہیں۔ لفظ جامع کے تحت عالم اسلام کی مشہور مساجد کے مختصر حالات کے علاوہ ان کی خوبصورت تصاویر بھی شامل ہیں۔ مشہور کتب میں جامع احکام القرآن (قرطبی) اور جامع البیان (طبری) جامع الکبیر اور جامع الصغیر (امام محمد بن حسن شیبانی)، جامع الصحیح البخاری صحیح مسلم اور سنن ترمذی، جامع الاصول لاحادیث الرسول (ابن الاثیر) الجمع بین الصحیحین، الجواب الصحیح (ابن تیمیہ)، ان کے قلمی نسخوں کی تصویریں بہت دیدہ زیب ہیں اور

جاوید نامہ (اقبال) پر اچھے خاصے مقالات ہیں۔

لفظ جماعت کے تحت جماعت اسلامی، جماعت تبلیغ اور جمعیۃ العلماء المسلمین (الجزائر) پر مفید مضامین ہیں۔ اول الذکر دو جماعتوں پر مضامین ایک ہندوستانی مسلمان مقیم انگلستان کے قلم سے ہیں۔ دینی مضامین میں الجلیل، الجبارہ، سورۃ جاثیہ، جزیہ اور جہاد قابل ذکر ہیں۔

مشاہیر ادبا، وعلماء میں جاحظ، جامی، امام جصاص رازی، جوالیقی، امام جوہری، سید جمال الدین افغانی، جمال الدین قاسمی دمشقی، عبدالقادر الجزائری، ڈاکٹر جواد علی اور حکمرانوں میں شہنشاہ جہانگیر، جہاں آرا بیگم، جہاں وار شاہ پر مقالات ہیں۔ قدرتی طور پر ترک مشاہیر پر مضامین زیادہ ہیں۔

سیکولرازم اور لادینیت کے اس دور میں ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی اشاعت ہر لحاظ سے مستحق تبریک وتحسین ہے۔ کاش کہ ان مقالات کو عربی رسم الخط میں بھی لکھا جا سکتا۔ ہاں میرا ایک مضمون "سیرت نگاران نبوی صلعم (بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں) آپ کے ہاں منتظر اشاعت ہے حسب گنجائش جب چاہیں اس کو شایع کر سکتے ہیں اگر یہ مضمون ایک ہی قسط میں شایع ہو سکے تو بڑا کرم ہوگا۔

فقط والسلام۔ نیازمند

(شیخ) نذیر حسین، لاہور

ادبیات

نمازِ عصر

(جو کربلا کے معرکۂ حق و باطل میں ادا ہوئی)

جناب جگن ناتھ آزاد صاحب

میری نوا میں سوزِ کہن رونما ہے آج　　　در پیش نغمگی کو عجب معرکہ ہے آج
دنیائے دل میں ایک قیامت بپا ہے آج　　　نوکِ قلم پہ تذکرۂ کربلا ہے آج

چھیڑا ہے آج دل نے شہادت کا تذکرہ
بے مثل و بے عدیل عبادت کا تذکرہ

گردوں سے بھی بلند تر اے کربلا کی خاک　　　میری نظر میں تو حرم کی طرح ہے پاک
کیسے کہوں کہ ذکر نہایت ہے دردناک　　　دامن میں تیرے پھول کا سینہ ہے چاک چاک

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ رسولؐ

لُو چل رہی ہے نام کو سایہ کہیں نہیں　　　حدت وہ ہے کہ وقت کی سانسیں ہیں آتشیں
آنکھیں اٹھا کے دیکھ ذرا اے دلِ حزیں　　　گردوں تنور ہے کرۂ نار ہے زمیں

اک شعلہ زار ہے کہ ہے میدانِ کربلا
اک آگ ہے کہ ریگِ بیابانِ کربلا

طوفاں بپا ہے، گرم ہے میدانِ کارزار　　　ہے قاتلوں سے محوِ دعا ایک شہسوار
اہلبیت اِدھر اُدھر انسان کا وقار　　　تنہا حسینؑ اور یزیدی کئی ہزار

اے گردشِ زمانہ ٹھہر جا ذرا یہیں
ایسی مثال پھر نہ ملے گی تجھے کہیں

وہ سامنے غنیم کی فوجیں ہیں دجلہ بار	ہیں اس طرف اکیلے حسینؑ اسپ پر سوار
دامن پہ ہے غبار، گریباں ہے تار تار	کانٹوں میں جیسے پھول ہو ایسا ہے دلفگار

آزاد! نوکِ خار کی زد پر ہے پھول دیکھ
ہاں دیکھ انقلابِ جہاں کا اصول دیکھ

اوپر تلے تپے ہوئے ذروں کا انتشار	ہتھیار جس قدر ہیں بدن پر ہیں شعلہ زار
اور اسکے ساتھ ساتھ ہیں چاروں طرف سے وار	سر تیغ سے شکستہ جگر تیر سے فگار

دو دن ہوئے ہیں پینے کو پانی ملا نہیں
لیکن نمازِ ظہر یہاں بھی قضا نہیں

اب ہیں نمازِ عصر کی ساعات بھی قریب	ہیں کوئی دم میں شام کے لمحات بھی قریب
اے دوپہر کی دھوپ! ہے اب رات بھی قریب	جس بات کا ہے ذکر وہ ہے بات بھی قریب

گھوڑے سے گر چکے ہیں شہِ مشرقین اب
سجدے میں سر جھکائے ہوئے ہیں حسینؑ اب

دیکھ اے نگاہ! دیکھ یہ منظر جگر خراش	تابِ نظر کہاں کہ کلیجہ ہے پاش پاش
فریاد سے فضاؤں میں پیدا ہے ارتعاش	کیا اے فلک تجھے تھی اسی وقت کی تلاش

دستِ قضا کو صبر ذرا بھی نہ ہو سکے
اور عصر کا فریضہ ادا بھی نہ ہو سکے

وہ ہاتھ اٹھا لعین کا شمشیر تول کر	بھرپور وار، جسم ادھر اور سر ادھر
اے کم نگاہ! رازِ حقیقت سے بے خبر	سجدہ یہی ہے سجدہ جو باطن پہ ہو نظر

روحِ حیات و روحِ شہادت یہی تو ہے
کہتے ہیں جس کو اصل عبادت یہی تو ہے

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کا تعلیمی نظام۔ جناب پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، متوسط

تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت وطباعت، مجلد صفحات ۸۸، قیمت ۴۵ روپیے،
پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

زیر نظر کتاب رسالہ جامعہ میں چھپنے والے چار مقالات کا مجموعہ ہے، پہلے مقالہ میں عرب وایران کے مشترکہ اسلامی تمدن کے زیر سایہ علمی وتعلیمی فروغ کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مکاتب کے علاوہ مساجد، کتب خانوں، قصہ گویوں اور اتالیقوں کے ذریعہ علمی وتعلیمی ترقی اور دیوان خانوں کی ادبی محفلوں کی اہمیت بتائی گئی ہے اور قاہرہ و بغداد، بخارا و سمرقند اور طوس و غزنہ کے چند اہم علمی مرکزوں اور کتب خانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور محمود غزنوی کے عہد تک ایران اور وسط ایشیا کی علمی وادبی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کو کیسی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ عہد وسطیٰ کے کتب خانوں کے نظم وانصرام اور لائبریرین کے فرائض کی تفصیل بھی دی ہے، دو مضامین مدارس کے قیام اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے عنوان سے ہیں ان میں اس خیال کو غلط بتایا ہے کہ دنیائے اسلام کا اولین مدرسہ یہی ہے بلکہ یہ حکومت کی سرپرستی اور کفالت میں قائم ہونے والا پہلا تعلیمی ادارہ ہے۔ چنانچہ مصنف نے کئی اہم مدارس کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ یہ سب اس سے پہلے ہی قائم ہوچکے

تھے، اس خیال کی بھی تغلیط کی گئی ہے کہ یہ مدارس محض شیعی اور معتزلی اثرات کو روکنے اور اہل سنت والجماعت کے مخالفین کو پسپا کرنے کے لیے قائم کیے گئے تھے بلکہ ان کے قیام کی وجہ دینی و دنیوی تعلیم کی روز افزوں ضرورت تھی، اسی بحث میں نظریۂ تعلیم سے متعلق حنفی و شافعی مسلک کا موازنہ بھی کیا ہے اور مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جانے والے غیر مذہبی یا سیکولر مضامین مثلاً ادب، ریاضی، فلسفہ، کیمیا، طب اور طبیعیات کی تفصیل بھی آگئی ہے، یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان کی سرکاری اور عوامی بالادستی کے باوجود مدارس کے دروازے دوسری زبانوں کے لیے بند نہیں تھے، چنانچہ ابوبکر وجیہ الدین الضریر نحوی بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں نحو کے استاد تھے لیکن وہ ترکی، فارسی، یونانی، آرمینی اور ایتھوپی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں کے طلبہ کی مشکلات کو خود ان کی زبانوں میں حل کرتے تھے، آخری مقالہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے متعلق ہے، اس میں فاضل مولف نے تحقیق و کاوش سے اس دور کے تعلیمی نظام و نصاب کا خاکہ پیش کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کے تمام معقولی و منقولی نظام تعلیم پر جمود و تقلید چھائی تھی اور قدما کے لکچر اور بحث و مباحثہ کے طریقے کے بجائے حاشیوں اور شرحوں میں پوری قوت ضائع ہو رہی تھی۔ یہ مقالہ مصنف کے غور و خوض کا نتیجہ اور برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ اور نہایت جامع ہے۔

رباعیات سرمد اردو ترجمہ از پال کمند عرش ملسیانی، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور نفیس طباعت و کتابت، مجلد مع دیدہ زیب گردپوش، صفحات ۳۰۹، قیمت درج نہیں، پتہ: انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کا تعلیمی نظام۔ جناب پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت وطباعت، مجلد صفحات ۸۸، قیمت ۴۵ روپیے، پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

زیر نظر کتاب رسالہ جامعہ میں چھپنے والے چار مقالات کا مجموعہ ہے، پہلے مقالہ میں عرب وایران کے مشترکہ اسلامی تمدن کے زیر سایہ علمی وتعلیمی فروغ کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مکاتب کے علاوہ مساجد، کتب خانوں، قصہ گویوں اور اتالیقوں کے ذریعہ علمی وتعلیمی ترقی اور دیوان خانوں کی ادبی محفلوں کی اہمیت بتائی گئی ہے اور قاہرہ و بغداد، بخارا و سمرقند اور طوس و غزنہ کے چند اہم علمی مرکزوں اور کتب خانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور محمود غزنوی کے عہد تک ایران اور وسط ایشیا کی علمی وادبی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کو کیسی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ عہد وسطیٰ کے کتب خانوں کے نظم وانصرام اور لائبریرین کے فرائض کی تفصیل بھی دی ہے، دو مضامین مدارس کے قیام اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے عنوان سے ہیں ان میں اس خیال کو غلط بتایا ہے کہ دنیائے اسلام کا اولین مدرسہ یہی ہے بلکہ یہ حکومت کی سرپرستی اور کفالت میں قائم ہونے والا پہلا تعلیمی ادارہ ہے۔ چنانچہ مصنف نے کئی اہم مدارس کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ یہ سب اس سے پہلے ہی قائم ہوچکے

تھے، اس خیال کی بھی تغلیط کی گئی ہے کہ یہ مدارس محض شیعی اور معتزلی اثرات کو روکنے اور اہل سنت والجماعت کے مخالفین کو پسپا کرنے کے لیے قائم کیے گئے تھے بلکہ ان کے قیام کی وجہ دینی و دنیوی تعلیم کی روز افزوں ضرورت تھی، اسی بحث میں نظریۂ تعلیم سے متعلق حنفی و شافعی مسلک کا موازنہ بھی کیا ہے اور مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جانے والے غیر مذہبی یا سیکولر مضامین مثلاً ادب، ریاضی، فلسفہ، کیمیا، طب اور طبیعیات کی تفصیل بھی آگئی ہے، یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان کی سرکاری اور عوامی بالادستی کے باوجود مدارس کے دروازے دوسری زبانوں کے لیے بند نہیں تھے، چنانچہ ابوبکر وجیہ الدین الضریر نحوی بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں نحو کے استاد تھے لیکن وہ ترکی، فارسی، یونانی، آرمینی اور یعقوبی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں کے طلبہ کی مشکلات کو خود ان کی زبانوں میں حل کرتے تھے، آخری مقالہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے متعلق ہے، اس میں فاضل مولف نے تحقیق و کاوش سے اس دور کے تعلیمی نظام و نصاب کا خاکہ پیش کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کے تمام معقولی و منقولی نظام تعلیم پر جمود و تقلید چھائی تھی اور قدما کے لکچر اور بحث و مباحثہ کے طریقے کے بجائے حاشیوں اور شرحوں میں پوری قوت ضائع ہو رہی تھی۔ یہ مقالہ مصنف کے غور و خوض کا نتیجہ اور برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ اور نہایت جامع ہے۔

رباعیات سرمد اردو ترجمہ از بال مکند عرش ملسیانی، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور نفیس طباعت و کتابت، مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش، صفحات ۲۰۵، قیمت درج نہیں، پتہ: انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

آزاد بھون، اندر پرستھ اسٹیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مشہور صوفی شاعر سرمد کی ذات خواہ جس قدر بھی مختلف فیہ رہی ہو لیکن اس کا کلام بہت مقبول ہے اور اب بھی اس کی رباعیوں کی اثر آفرینی میں کمی نہیں آئی ہے جو دنیا کی بے حقیقتی اور ترک ہوا و ہوس کے مضامین اور مسائل تصوف کے بیان سے مالا مال ہیں ان کی مقبولیت کی وجہ سے ان کے دو منظوم اردو ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ پہلا ترجمہ منشی سید نواب علی صولت لکھنوی نے تقریباً پون صدی قبل رباعیات سرمد کے نام سے شایع کیا تھا اور دوسرا جناب عرش ملسیانی نے نغمہ سرمد کے نام سے شایع کیا۔ یہ بھی کئی برس پہلے شایع ہوا تھا اب پھر اس کا جدید اڈیشن شائع ہوا ہے جو نہایت خوبصورت ہے اور اس کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں سرمد پر مولانا ابوالکلام آزاد کے معروف و مشہور مضمون کو شامل کیا گیا ہے اور موجودہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کا فاضلانہ پیش لفظ بھی اس کی زینت بنا ہے۔ لیکن پہلے اڈیشن میں سرمد کے سوانح پر فاضل مترجم کا جو مفید اور معلوماتی مضمون شامل تھا معلوم نہیں کیوں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی کے لیے جناب عرش ملسیانی کا نام ہی پوری ضمانت ہے جس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو ؎

عمری کہ شد است صرف در لہو و لعب   بے پرسش اگر عفو کنند نیست عجب
کی زشتی افعال در آرد بہ نظر   آنرا کہ کرم بود فزون تر ز غضب

ترجمہ یوں کیا ہے:

جس عمر کا مقصود رہا لہو و لعب   بے پرسش اسے عفو کیے کیا ہے عجب

ہیں جس کی عنایات بہت کم ہے غضب اعمال زبوں کی اس کو پروا کیا ہے

یہاں صولت لکھنوی کا ترجمہ بھی دلچسپی کے لائق ہے۔

ممکن ہے کہ دم بھر میں ہو بخشش میری گو لہو و لعب میں عمر ساری گزری

کب میرے گنا ہوں پہ نظر ہے اسکی ہے جس کا کرم قہر و غضب سے افزوں

علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علماء

از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۲، قیمت ۶۰ روپیے، پتہ، پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

زیر نظر کتاب فاضل مولف کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں اخوان الصفا کے علاوہ تمام مضامین ہندوستان کے چند اہل علم و کمال خصوصاً مفسرین کے سوانح اور ان کی تفسیروں سے متعلق ہیں مثلاً خواجہ گیسو دراز، شیخ مبارک، فیضی، حسن محمد بن میانجیو، سر سید اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ، ایک جدا مضمون قرآن کے اردو تراجم اور تفاسیر کے عنوان سے بھی ہے، جس پر پہلے ان کی مستقل کتاب بھی شایع ہو چکی ہے، عربی مدارس کے نظام تعلیم پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کی جدید تعلیم گاہوں اور مدارس دینیہ میں ربط و تعلق کے استحکام کو قائم کرنے اور بدظنی کی خلیج کو دور کرنے کے لیے بعض مشورے بھی دیے ہیں جو توجہ کے لائق ہیں، کاکوری کے بزرگوں کے تذکرہ گلشن کرم کے تعارف کے علاوہ امیر خسرو، چارلس ایمبروز اسٹوری اور مولانا اسلم جیراجپوری پر بھی مفید مضامین ہیں۔

دکن کا عہد اسلامی

مرتبہ جناب عمر خالدی اور جناب معین الدین عقیل، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۱۰۰، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: حیدرآباد ہسٹاریکل سوسائٹی، ۵۰ ڈف (DUFF) اسٹریٹ، واٹرٹاؤن، ایم اے ۳۰۱۶-۰۲۱۷۲ یو ایس اے۔

دکن ہند قریباً پانچ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت اور تہذیب و تمدن سے فیضیاب ہوتا رہا، اس طویل عہد کی تاریخ پر اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبانوں میں بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے، ان کے شمار و قطار کے دشوار گذار کام کا بیڑا جناب عمر خالدی نے اٹھایا اور ۷۵ء و ۸۰ء میں انھوں نے انگریزی کتابوں اور مقالات کی دو جامع فہرستیں امریکہ سے شایع کیں؛ انکی پذیرائی سے اردو و فارسی کے دکنی ذخیرہ کی کتابیات تیار کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا، زیر نظر کتاب اسی کاوش کا ثمرہ ہے، اور بقول مولفین "یہ ایک ابتدائی اور بہ عجلت کوشش مرتب ہونے والی فہرست ہے اسلئے یہ محض مطبوعہ اور فوری طور پر دستیاب ہونے والی کتابوں اور مقالوں تک محدود ہے" تاہم اس منتخب کتابیات نے خاصی معلومات کا استقصاء کر لیا ہے، تاریخ دکن، مذہب، معاشرت، سوانحی مآخذ، دکنی ادب، اسناد و مآخذ اور متفرقات کے زیر عنوان مختلف ابواب ہیں اور ان میں بھی ذیلی عنوانات کے تحت بڑے سلیقہ سے الفبائی ترتیب میں اشخاص و مضامین کو جمع کیا گیا ہے، دکنیات کے شیدائیوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے، کمپیوٹر کی طباعت خوبصورت ہے اور اغلاط سے یکسر پاک ہے اور اس نے کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

ع۔ ص۔